Regd. L. No. 7243 Phone

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

فروری 1979

اس پرچہ میں :

قائداعظم رح کے یوم پیدائش پر خطاب

توڑ دیتا ہے کوئی "موسیٰ" طلسم سامری

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲-لاہور

قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

قیمت فی پرچہ	ٹیلیفون	بدلِ اشتراک
۳ تین روپے	۸۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور	سالانہ پاکستان ——— ۳۶ روپے غیر ممالک ——— ۲/۱ ۲ پونڈ
شمارہ ۲	فروری سنہ ۱۹۷۹ء	جلد ۳۲

فہرست

۱۔ لمعات ۲

۲۔ توڑ دیتا ہے کوئی "موسیٰ" طلسمِ سامری! .... خطاب پرویز صاحب ۹
(میاں طفیل محمد صاحب کے ٹیلی ویژن انٹرویو کا جائزہ)

۳۔ نظامِ ربوبیت ۳۴

۴۔ شرعی سزائیں .... (ابوالاعلیٰ مودودی صاحب) ۳۵

۵۔ حقائق و عبر .... (۱) بیس سال پہلے کی بات (ایرانی شہنشاہیت) ۳۹
(۲) جوش و خروش

۶۔ عائلی قوانین کا جائزہ (قرآن کی روشنی میں) ۴۳

۷۔ نقد و نظر .... (۱) فتاویٰ عالمگیری ۵۷
(۲) اسلامی قانون کا فلسفہ۔ (۳) یتیم پوتے کی وراثت۔
(۴) یتیم پوتے کا حقِ وراثت۔

——— (٥) ———

ایڈیٹر محمد خلیل۔ پبلشر سراج الحق۔ مقامِ اشاعت ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور۔ پرنٹر شیخ نیاز احمد۔ مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس ۱۷ ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

نظامِ مصطفٰے جس کا چرچا قریب دو سال سے سنتے چلے آرہے تھے، اس کے قدمِ اوّل کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ ۱۲ ربیع الاوّل کے مقدس دن کو اٹھایا جائے گا۔ یعنی اس دن شرعی سزاؤں سے متعلق قوانین کے نفاذ کا اعلان کیا جائے گا۔ ملک میں اسلامی نظام کے احیاء کی خواہش بڑی مبارک و مسعود ہے۔ لیکن خواہش کیسی ہی مبارک اور نیک کیوں نہ ہو، اس کی صحیح نتیجہ خیزی کے لئے حسنِ تدبر لازم اور لاینفک ہے۔ کتنی ہی نیک خواہشیں اور مبارک ارادے ہیں جو عدم تدبر کی وجہ سے نہ صرف ناکام رہ جاتے ہیں بلکہ تخریبی نتائج پیدا کر دیتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے کتاب کے ساتھ حکمت کو بھی جو منزل من اللہ قرار دیا ہے تو اس سے یہی مراد ہے۔ کتاب کے معنی قانون کے ہیں اور حکمت سے مراد وہ حسنِ تدبر ہے جس کی رو سے اس قانون کو نافذ کیا جاتا اور صحیح نتائج برآمد کرنے کا ضامن بنایا جاتا ہے۔ اس حسنِ تدبر میں ترجیحات (PRIORITIES) یا تدریج کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ یہ اسی عملِ تدریج کا نتیجہ تھا کہ، خود حضورؐ نبی اکرم کے قائم کردہ نظام میں، شراب جیسی اُمّ الخبائث کی ممانعت، آغازِ نبوت سے قریب اٹھارہ سال بعد عمل میں آئی۔ اور اس پر بھی قرآنِ کریم نے اس کی کوئی سزا خود متعین نہ کی۔ عملِ تدریج کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو معاشرہ کے نظام میں سزاؤں کی باری سب سے آخر میں آتی ہے۔ معاشرہ کی اصلاح کا آغاز بچوں کی صحیح پرورش اور تربیت سے ہوتا ہے۔ پھر ان کی تعلیم صحیح خطوط پر کی جاتی ہے۔ معاشرہ میں حالات ایسے پیدا کئے جاتے ہیں جن میں قانون کا احترام اور اتباع افرادِ معاشرہ کا اندرونی تقاضا بن جائے۔ قانون کے قیام و استحکام کے لئے ایسی انتظامیہ وجود میں لائی جاتی ہے جو اخلاقی اعتبار سے پاک اور صاف ہو۔ نزاعی امور کے تصفیہ کے لئے ایسا نظامِ عدل قائم کیا جاتا ہے جو ہر قسم کی لغزش سے منزہ ہو۔ اس قسم کے اہتمامات اور انتظامات کے بعد، اگر معاشرہ میں ایسے نفسیاتی مریض باقی رہ جائیں جن کے دیوانہ پن سے معاشرہ کو نقصان کا اندیشہ ہو تو معاشرہ کی حفاظت اور خود ان کی اصلاح کے لئے سزائیں تجویز ہوتی ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ معاشرتی اصلاح میں سزاؤں کی باری سب سے آخر میں آتی ہے۔ قرآنِ کریم میں بھی سزا کے لئے کہیں عقاب کی اصطلاح آئی ہے (فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ۔ 13/32)۔ اور کہیں عَاقِبَة کی (فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ۔ 7/84)۔ عقاب ہو یا عاقبۃ اور عقوبت، ان کے عام معنی انجام کے ہیں۔ یعنی معاشرتی پروگرام میں سب سے آخر

میں آنے والی کڑی ـــــ اگر معاشرہ کی اوّلیں کڑیاں درست ہوں، تو اس آخری کڑی کی نوبت شاذ و نادر ہی آتی ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ خلافتِ صدیقیؓ میں حضرت عمرؓ کو مدینہ کا مجسٹریٹ مقرر کیا گیا تو انہوں نے سال بھر کے بعد رپورٹ کی کہ اس اسامی کو کالعدم قرار دیا جائے کیونکہ سال بھر میں ان کے سامنے کوئی مقدمہ ہی پیش نہیں ہوا۔ ظاہر ہے کہ معاشرہ کی یہ کیفیت "سخت سزاؤں" کی پیدا کردہ نہیں تھی ـــــ سزاؤں کی تو وہاں ہنوز نوبت ہی نہیں آئی تھی ـــــ یہ پیدا کردہ تھی اس اصلاحی پروگرام کی جو افرادِ معاشرہ میں اندرونی (نفسیاتی) تبدیلی کے لئے بتدریج عمل میں لایا گیا تھا۔ اس لئے کہ ان کے سامنے یہ ارشادِ خداوندی تھا کہ: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (۱۳/۱۱)۔ (تم تو ایک طرف) خدا بھی اس معاشرہ میں کوئی تبدیلی نہیں کرتا جب تک وہ معاشرہ اپنے افراد میں اندرونی (قلب و نگاہ کی نفسیاتی) تبدیلی پیدا نہ کرے۔

ہمارے ہاں اٹھتے بیٹھتے کہا جاتا ہے کہ سعودی عرب کو دیکھئے۔ وہاں شرعی سزائیں نافذ ہیں جس کی وجہ سے وہاں جرائم کا سدِّباب ہو گیا ہے۔ سعودی عرب میں جرائم کی کیا حالت ہے، اس کی بابت تو ہم کچھ کہہ نہیں سکتے، لیکن ان سزاؤں کے باوجود وہاں کے معاشرہ کی حالت کیا ہے، اس کے متعلق ہم سے نہیں، سعودی عرب کی سب سے بڑی مداح، جماعتِ اسلامی کی زبان سے سنئے۔ اس جماعت کے ترجمان ہفتہ وار ایشیا کی یکم جنوری ۱۹۷۸ء کی اشاعت میں، اس کے نامہ نگار متعینہ سعودی عرب (محمد امین ریاض صاحب) کا ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس میں لکھا تھا:۔

> اصولی طور پر یہ سمجھ لینے کی بات ہے کہ اسلامی قوانین کا اجراء اگرچہ بہت بڑا کارنامہ ہے اور اس کام کے بطریقِ احسن نبھ جانے کے لئے ایک مدت، محنتِ شاقہ اور بڑے تدبر کی ضرورت ہے۔ لیکن مجردِ اسلامی قوانین کے اجراء سے اسلامی انقلاب نہیں آئے گا۔ اگر اسلامی نظام و قانون نافذ کرنے سے مراد اس قانونی اور اجتماعی ڈھانچے کا مہیا کرنا ہے جو اسلامی اصولوں پر مبنی ہو تو یہ قطعاً لازمی نہیں ہے کہ اس ڈھانچے کے مہیا ہو جانے کے ساتھ ہی معاشرے میں وہ انقلاب بھی برپا ہو جائے اور وہ تبدیلیاں رونما ہو جائیں جو اسلام کا مطلوبِ حقیقی ہیں کہ لوگ نیک اور متقی ہو جائیں۔ نماز، زکوٰۃ اور روزہ پر عمل ہر سو نظر آنے لگے۔ چوریاں اور قتل ختم ہو جائیں گے، یا ہر طرف دودھ کی نہریں بہیں گی۔ اس کی جیتی جاگتی مثال سعودی عرب کی صورت میں سب کے سامنے ہے۔ اس ملک میں اجتماعی اور قانونی ڈھانچہ الحمد للہ ابھی تک اسلام کی اساس پر ہے لیکن تجربے کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت اسلامی انقلاب کی جتنی

ضرورت سعودی عرب کو ہے شاید پاکستان کو بھی نہیں، کیونکہ اس قانونی ڈھانچے کے باوجود یہاں وہ سب کچھ ہوتا ہے جو دوسری دنیا میں ہو رہا ہے۔

سعودی معاشرے کے تنزل کی داستان، محض زیب داستان کے لئے نہیں ہے بلکہ چند سال کے گہرے مشاہدے کی بنا پر میں نے یہ بات کہنے کی جرأت کی ہے۔ اخلاقی انحطاط کو دیکھتے ہوئے دل لرز اٹھتا ہے اور بے ساختہ ہاتھ دعا کے لئے اٹھتے ہیں کہ اے رب ذوالجلال اس سرزمین کو ہر شر سے محفوظ فرما دے کہ اسے تیرے جلیل شان، اور تیرے حبیب صلعم کے گھر سے نسبت ہے۔ آمین۔ یہ انحطاط پذیر سعودی معاشرہ، اس حقیقت کی موجودگی میں کہ یہاں قوانین کی اساس اسلام پر ہے، ہر کسی کے سامنے کھلی کتاب کی طرح موجود ہے۔ ذہن اس بات کو ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ انحطاط اگر رک سکتا ہے تو صرف اس طرح کہ قرآن کی روشنی سے عوام کے قلوب کو منور کیا جائے۔ عمل پر ابھارنے کے لئے ان پر پیہم محنت کی جائے۔

اس کے بعد لکھا ہے:۔

اسلام میں اصل مقصود قانون کو تبدیل کرنے سے زیادہ انسانوں کو تبدیل کرنا ہے اور یہ تبدیلی ڈنڈے کے زور سے پیدا نہیں ہوتی، قلوب اور اذہان میں انقلاب سے ہی یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص نماز نہ پڑھنا چاہے تو ڈنڈے کے زور سے اسے نماز کا عادی نہیں بنایا جا سکتا۔ لیکن اس کے برعکس جو نماز پڑھنا چاہتا ہے وہ شیروں کی کچھار اور تمنتہ دار پر بھی نماز سے غافل نہ ہوگا۔ لہٰذا حقیقی اور پائیدار تبدیلی اوپر کے بجائے نیچے سے ہی ممکن ہے۔ اوپر سے آنے والی تبدیلی خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتی ہے اور نیچے سے آنے والی تبدیلی بدر میں جان لڑا کر سرفراز ہوتی ہے، ہاتھوں میں اٹھے جام ٹوٹتے ہیں، شراب گلیوں میں بہتی ہے، خود حاضر ہو کر اپنے آپ کو سزا کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔[ط]

آپ نے ملاحظہ فرما لیا کہ جس ملک کو اسلامی نقطۂ نگاہ سے مثالی کہہ کر پیش کیا جاتا ہے، اس میں شرعی سزاؤں کے نفاذ کے باوجود، معاشرہ کی حالت کیا ہے؟

ہماری سوچ کا بنیادی نقص یہ ہے کہ ہم مرض کے علاج کے لئے علت مرض (مرض کے بنیادی سبب) کی اصلاح کی طرف توجہ نہیں کرتے، علامات مرض کی سطحی مرہم پٹی کو علاج سمجھ لیتے ہیں۔ اس نکتہ کو ذرا غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ جن جرائم کی شرعی سزاؤں کے نفاذ کا پروگرام زیر تجویز ہے۔ (یعنی چوری، زنا، شراب نوشی وغیرہ) مروجہ قوانین کی رو سے بھی وہ جرائم ہیں اور ان کی سزائیں بھی مقرر ہیں۔ اس کے باوجود یہ شکایت عام ہے کہ حقیقی مجرموں کو سزائیں نہیں ملتیں اور بے گناہ پکڑے اور مارے

ط اس معاشرہ کو مثالی اسلامی معاشرہ کہہ کر پیش کیا جاتا ہے۔

جاتے ہیں۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ یہاں رشوت کا چلن عام ہے۔ اس باب میں پہلے تو پولیس ہی بدنام تھی۔ اب عام عدالتوں کے بارے میں بھی چہ میگوئیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اثباتِ جرم کے لئے جس طرح شہادات وضع کی جاتی ہیں اس کا بھی کسے علم نہیں۔

آپ سوچئے کہ تفتیشی اور عدالتی مشینری تو ویسے کی ویسی رہے اور سزائیں کر دی جائیں زیادہ سخت، تو کیا اس سے جرائم کی اصلاح ہو جائے گی؟ اصلاح تو ایک طرف، اس سے خرابی اور بھی بڑھ جائے گی۔ بات واضح ہے۔ اگر کسی جرم کی سزا (مثلاً) تین ماہ قید ہو تو اس میں رشوت کا "ریٹ" ہزار پانسو سے زیادہ نہیں ہوگا۔ لیکن اگر اسی جرم کی سزا ہاتھ کاٹ دینا یا سنگسار کر دینا ہو تو رشوت کا ریٹ آسمان سے باتیں کرنے لگ جائے گا۔ ملزم اپنا گھر بار بیچ کر بھی رشوت کا مطالبہ پورا کرے گا۔ اس ایک مثال سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ تفتیشی مشینری اور نظامِ عدل کی اصلاح کے بغیر، سزاؤں کی سختی کیا نتائج پیدا کرے گی؟[1]

اصل یہ ہے کہ قرآن کریم کے تعزیری احکام تجویز ہی "اسلامی معاشرہ" کے لئے کئے گئے تھے۔ اسلامی معاشرہ میں کیفیت کیا ہوتی ہے، اس کا اندازہ بھی ایک مثال سے لگا لیجئے۔ اثباتِ جرم کا بنیادی مدار شہادت پر ہوتا ہے۔ اسلامی معاشرہ میں شہادت کے متعلق ارشادِ خداوندی (جس کی تعمیل افرادِ معاشرہ اپنا فریضہ سمجھتے ہیں) ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ ۚ إِن يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا فَاللَّهُ أَوْلَىٰ بِهِمَا ۖ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَن تَعْدِلُوا ۚ وَإِن تَلْوُوا أَوْ تُعْرِضُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ۔ (۴/۱۳۵)

اے اہلِ ایمان! تم ہمیشہ نظامِ عدل کو قائم رکھو۔ اس کی اوّلین شرط یہ ہے کہ اگر تمہیں کہیں گواہی دینی ہو تو تم نہ مدعی کی طرف سے گواہ بن کر پیش ہو نہ مدعا علیہ کی طرف سے۔ تم خدا کی طرف سے گواہ بن کر جاؤ اور سچی سچی شہادت دو، خواہ یہ شہادت خود تمہارے اپنے خلاف ہی کیوں نہ جائے۔ یا تمہارے والدین یا دیگر رشتہ داروں کے خلاف۔ اس باب میں امیر اور غریب میں بھی کوئی فرق نہ کرو (حتیٰ کہ دوست اور دشمن میں بھی نہیں۔ ۵/۸)۔ تم جادۂ حق و صداقت سے ہٹ کر ان کے بہی خواہ مت بنو۔ خدا کو ان کی بہی خواہی کی تم سے زیادہ فکر ہے۔ اس کا بھی خیال رکھو کہ تمہارے جذبات اور میلانات کہیں عدل کی راہ میں حائل نہ ہو جائیں۔ نہ ہی کوئی پیچیدار اور ذو معنی بات کہو۔ نہ ہی شہادت دینے سے پہلو تہی کرو۔

---

[1] اس سلسلہ میں آپ مودودی صاحب کی ان تصریحات پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے جو اسی اشاعت میں دوسرے مقام پر "شرعی سزاؤں" کے عنوان سے شائع ہو رہی ہیں۔

یاد رکھو! اللہ کا قانونِ مکافات تمہارے تمام اعمال، جذبات اور رجحانات سے باخبر ہے۔
جہاں تک عدالت کا تعلق ہے، اور تو اور، خدا نے اپنے ایک جلیل القدر رسول سے فرمایا کہ:-

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰی فَیُضِلَّكَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ۔ (۳۸/۲۶)۔

اے داؤد! ہم نے تمہیں اقتدار اور اختیار عطا فرمایا ہے تو لوگوں کے معاملات میں الحق (احکام خداوندی) کے مطابق عدل کرو اور اپنے جذبات، رجحانات اور خواہشات کا اتباع نہ کرو۔ اگر ایسا کرو گے تو تم خدا کی طرف جانے والے راستے سے گمراہ ہو جاؤ گے۔

اسلامی سزائیں اس معاشرہ کے لئے ہیں جہاں گواہ اس کردار کے حامل ہوں اور جج اس پاکیزگی سیرت کے پیکر۔ اس کے ساتھ معاشرہ کی فضا بھی ایسی ہو جس میں نہ جرائم کے محرکات موجود ہوں اور نہ ہی کسی کو ارتکابِ جرم پر مجبور کرنے کے اسباب اور مقتضیات۔ اس قسم کی بلندیٔ کردار اور پاکیزگیٔ سیرت اس پروگرام سے پیدا ہوتی ہے جسے قرآن کریم نے نفسیاتی تبدیلی سے تعبیر کیا ہے۔ اس تبدیلی کے بغیر، جرائم کا سدِباب تو ایک طرف، عادات و اطوار میں بھی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس کی واضح مثال بھی ہمارے سامنے ہے۔ حال ہی میں صدرِ مملکت نے ملازمینِ حکومت کو نماز پڑھنے کی تلقین کی۔ نماز، فریضۂ خداوندی ہے اس لئے اس کی ادائیگی ہر مسلمان پر لازمی ہے۔ اس فریضۂ خداوندی کے ساتھ صدرِ مملکت کی طرف سے اس کی تلقین بھی ہوئی۔ اس کا نتیجہ کیا نکلا، اسے ذیل کی خبر سے ملاحظہ فرمائیے:-

۴ رجنوری ۱۹۷۹ء کے روزنامہ "نوائے وقت" لاہور میں یہ افسوسناک خبر شائع ہوئی ہے کہ صدر جنرل ضیاء الحق نے سرکاری اداروں میں نماز باجماعت کے اہتمام کی جو تلقین کی تھی اور جس کے لئے آدھے گھنٹے کا وقفہ بھی دے دیا گیا تھا، سرکاری ملازمین نے چند ہفتے تو اس میں دلچسپی سے حصہ لیا اور مساجد میں نمازِ ظہر کے وقت خاصی رونق رہی مگر بتدریج سرکاری ملازموں نے نمازِ ظہر کے وقت اپنے دفاتر سے نکلنا شروع کر دیا اور اس طرح نماز کی باجماعت ادائیگی کو دفتر سے غیر حاضر رہنے کا بہانہ بنا لیا گیا۔ بعض سرکاری ملازم تو ظہر کی اذان کے بعد اپنے دفاتر میں واپس ہی نہیں آتے۔ یہ صورتِ حال پنجاب کے سول سیکرٹریٹ کی مسجد سمیت دیگر تمام دفاتر کی مساجد میں ہے۔ سول سیکرٹریٹ میں جہاں دسمبر کے اوائل میں پوری مسجد نمازیوں سے بھر جاتی تھی اب وہاں روزانہ صرف ۴ صفیں ہوتی ہیں جو معمول کے مطابق ہیں۔ (بحوالہ الاعتصام۔ مورخہ ۱۲/۱/۷۹)

اسلامی نظام کا آغاز سزاؤں سے کرنے کا ایک نقصان تو وہ ہوگا جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ یعنی اس سے رشوتوں کے دروازے وسیع ہو جائیں گے لیکن اس سے بھی زیادہ نقصان ایک اور ہوگا۔ ہم نے صدیوں کے بعد اسلامی نظام کے احیا کا دعویٰ اور اس کے انسانیت ساز نتائج کا فردوس بداماں منظر دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس وقت ساری دنیا کی نگاہیں، اس منظر کو دیکھنے کے لئے ہماری طرف لگ رہی ہیں۔ اگر زیرِ نظر تجربہ ناکام رہا، تو دنیا ہمارے متعلق جو کہے گی سو کہے گی۔ وہ اسلام کے

متعلق اپنے اس خیال میں پختہ ہو جائیگی کہ یہ ایک چلا ہوا کارتوس ہے جو زمانے کے بدلے ہوئے حالات کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اور ان کے اس پراپیگنڈہ سے خود ہمارے ہاں کا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ متاثر ہو کر اسلام کی طرف سے بددل ہو جائیگا۔ اور اس کی یہ بددلی خود پاکستان کے مستقبل کو بُری طرح مجروح کر دیگی۔ یہ ایسا نقصان ہوگا جس کی تلافی نہیں ہو سکے گی۔

مجوزہ قوانین کے نفاذ کے سلسلہ میں ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے۔ مرکزی حکومت کے وزیر قانون، محترم برڑہی صاحب نے اسلامک لا کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ موجودہ (مارشل لا) حکومت عبوری ہے اس لئے اس کے صادر کردہ احکام اور نافذ کردہ قوانین عارضی نوعیت کے ہیں۔ یہ اس کے بعد آنے والی منتخبہ مجلسِ قانون ساز کے لئے ہوگا کہ وہ انہیں قانونی تحفظ دے دے، تبدیل کر دے یا منسوخ کر دے۔ (پاکستان ٹائمز مورخہ ۱۴ و ۱۷ جنوری ۱۹۷۹ء) ان حالات کے پیشِ نظر، اور تو اور، خود مودودی صاحب کے ماہنامہ ترجمان القرآن، نے محترم صدر ضیاء الحق صاحب کو مشورہ دیا ہے کہ وہ اپنے گذشتہ محرم کے اعلان کو واپس لے لیں جس میں شریعت بنچوں کے قیام اور مروّجہ قوانین کو کتاب و سنت کے منافی ہونے کی بنا پر چیلنج کئے جانے کا حق دیا گیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے:۔

اب اعلامیۂ محرم کے دوسرے پہلوؤں کے متعلق چند باتیں۔

اوّل جب اعلان ہوا تھا کہ بہت جلد ایسا دستوری فیصلہ سامنے آجائے گا کہ جس کے تحت کسی بھی قانون کو اس بنیاد پر چیلنج کیا جا سکے گا کہ وہ شریعت کے خلاف ہے ـــــ تو اسی وقت مجھے پریشانی ہوئی کہ ایسا ہونا کسی قلیل مدت میں ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ جب تک پورے قانونی نظام، مالیاتی نظام، اور عدالتی نظام (بلکہ تعلیمی اور فوجی نظام وغیرہ بھی شامل ہیں) کی تشکیلِ نو شریعت کے مطابق نہیں کر لی جاتی، اس قسم کا حکم یا دستوری فرمان سخت مشکلات پیدا کرے گا۔ بلکہ سب کچھ ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔

اور اب اس اعلان کی مشکل کو حل کرنے کے لئے اتنے قوانین اور اداروں کو آئینی تحفظ دے دیا گیا ہے کہ اعلان کے مطابق چیلنج کرنے کے حکم کا دائرۂ اثر بے حد محدود بلکہ برائے نام ہے۔ آخر خواہ مخواہ اس اعلان کو نبھانے کی ضرورت کیا تھی۔ جو لے دے اب وسیع دائرۂ تحفظ کے خلاف ہو رہی ہے، زیادہ سے زیادہ اتنی ہی ترکِ اعلان کے بارے میں ہو جاتی۔

ذمہ داری دراصل سی، ایم، ایل، اے جنرل محمد ضیاء الحق کے ان قانونی مشیروں پر جاتی ہے جنہوں نے ایک قانونی فیصلے کے اثرات کا بروقت اندازہ نہیں کیا۔

اب بھی کوئی چارۂ کار اس کے سوا نہیں ہے کہ یہ اقرار کر لیا جائے کہ متذکرہ اعلان کے تقاضے پورے کرنے کا وقت ابھی دور ہے فی الحال اسے واپس لیا جاتا ہے۔

(ترجمان القرآن بابت جنوری ۱۹۷۹ء۔ صـ۶)

ان حضرات کو کون بتائے کہ اسلامی قوانین کے سلسلہ میں جو الجھنیں پیدا ہو رہی (یا پیدا کی جا رہی) ہیں، ان کی ذمہ داری جنرل محمد ضیاء الحق کے قانونی مشیروں پر تو جس قدر عائد ہوتی ہے، ہوتی ہے۔ ان سے کہیں زیادہ

ذمہ دار خود آپ حضرات ہیں۔ آپ کی حالت یہ ہے کہ ایک طرف مودودی صاحب بالتصریح ارشاد فرماتے ہیں کہ اس قسم کے معاشرہ میں جو یہاں موجود ہے، اسلامی تعزیرات نافذ کرنے والی حکومت ظالم قرار پائے گی۔ اور ان کے زیرِ ادارت شائع ہونے والا صحیفہ، صدرِ مملکت کے اعلان کو واپس لینے کا مشورہ دیتا ہے۔ لیکن دوسری طرف اسی جماعت کی مجلسِ شوریٰ اپنے اجلاس منعقدہ اوائل جنوری ۷۹ء میں حسبِ ذیل قرار داد منظور کرتی ہے:۔

مجلسِ شوریٰ جماعتِ اسلامی پاکستان کا یہ اجلاس صدرِ مملکت کے نئے ہجری سال کے آغاز پر اس اعلان کا خیر مقدم کرتا ہے کہ بارہ ربیع الاوّل کو ملک کے چاروں ہائی کورٹوں اور سپریم کورٹ میں شریعت بنچ قائم کر دیئے جائیں گے جو قرآن و سنت کے منافی قوانین کو کالعدم قرار دے سکیں گے۔ اس کے علاوہ چوری۔ ڈاکہ، قذف اور زنا کی اسلامی سزاؤں اور تحفظِ عفیفہ کا قانون بھی نافذ کر دیا جائے گا۔ مجلسِ شوریٰ یہ توقع رکھتی ہے کہ اب ان اقدامات کے عملی جامہ پہنانے میں کوئی تاخیر روا نہ رکھی جائے گی۔

(ایشیاء، لاہور۔ مورخہ ۷ جنوری ۱۹۷۹ء)

اس جماعت کی اسی قسم کی دورُخی پالیسی ہے جو یہاں اسلام کے نام پر الجھاؤ پر الجھاؤ پیدا کئے چلی آ رہی ہے ——— انتخابات میں حصّہ لینا قطعاً جائز نہیں۔ انتخابات میں حصّہ لینا عین مطابقِ اسلام ہے۔ عورتوں کو سیاست میں حصّہ لینے کا حق حاصل نہیں، عورت منصبِ صدارت پر بھی فائز ہو سکتی ہے۔ ملکیتِ زمین پر حد بندی کرنا اسلام کے سخت خلاف ہے، زمین کے رقبوں کی تحدید مطابقِ اسلام ہے۔ نیشنلائیزیشن ابلیس کا وضع کردہ نظام ہے۔ اسلام میں نیشنلائیزیشن کی اجازت ہے۔ صدر کا ویٹو کا حق اسلامی نظامِ حکومت کے عین مطابق ہے۔ ویٹو کا حق فرعونی استبداد کی یادگار ہے۔ کتاب و سنت کی رو سے پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب نہیں کیا جا سکتا جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں، حکومت کو چاہیئے کہ کتاب و سنت کے مطابق پبلک لاز کا ضابطہ جلد از جلد مرتب کرے۔ وقس علیٰ ہذا۔ اور اب، معاشرہ کی اصلاح کے بغیر شرعی سزاؤں کا نفاذ ظلم ہے۔ معاشرہ جیسا تیسا بھی ہے شرعی سزاؤں کا نفاذ بلا تاخیر، نہایت مبارک اور مسعود اقدام ہے۔

اب فرمایئے! حکومت بیچاری کیا کرے اور اس کے مشیر کیا؟

(تحریر نمود ..... ۲۰ جنوری ۱۹۷۹ء)

(۱) پرچہ کی ترسیل کے متعلق خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیئے تاکہ جواب میں تاخیر نہ ہو۔ اور پرچہ نہ ملنے کی صورت میں ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ سے پہلے اطلاع دیجیئے۔

(۲) جواب طلب امور کے لیئے جوابی لفافہ لکھیئے۔

(ناظمِ ادارہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قائدِ اعظمؒ کے یومِ پیدائش کی تقریب (دسمبر ۱۹۷۸ء) پر

پرویز صاحب کا خطاب

توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسمِ سامری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسمِ سامری

پرویز

حضرات انبیاء کرامؑ وعظ کہنے نہیں آیا کرتے تھے۔ وہ عظیم انقلابی شخصیتیں تھیں جن کا منصب یہ تھا کہ وہ انسانوں کے خود ساختہ باطل نظام کو مٹا کر اس کی جگہ خدا کا متعین فرمودہ نظام (الدّین) قائم کریں اور اس طرح مجبور اور مقہور انسانیت کو مستبد قوتوں کے آہنی شکنجوں سے چھڑا کر اسے شرفِ انسانیت سے ہمکنار کر دیں۔ انبیاءؑ سابقہ اور اقوامِ گذشتہ کے جو قصّے قرآن کریم میں مذکور ہیں وہ انہی انقلابی داستانوں کے اجزاء ہیں ۔ اجزاء اس لئے کہ ایک نبی کے زمانے میں مروجہ نظام کی جو شق سب سے زیادہ نمایاں اور غالب تھی اور اس کے خلاف اس رسول نے خصوصیت سے جد وجہد کی تھی، قرآن کریم میں اُسے خصوصیت سے بیان کیا گیا ہے۔ ان داستانوں میں صاحبِ ضربِ کلیم (حضرت موسیٰؑ) اور فرعون کی کشمکش زیادہ تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔ اس کی خصوصی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ مستبد انسانی نظاموں کے تین بنیادی ستون ہیں یعنی ملوکیت، نظام سرمایہ داری اور انکی تائید میں (خود وضع کردہ) خدائی سند پیش کرنے والی مذہبی پیشوائیت۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں یہ تینوں انسانیت کُش لعنتیں یکجا جامع تھیں اور ان کے آہنی شکنجوں میں جکڑی ہوئی قوم بنی اسرائیل۔ چونکہ باطل کے انسانی نظام نے جہاں کہیں بھی نمودار ہونا تھا اس میں یہی ستون نمایاں طور پر سامنے آنے تھے اس لئے قرآن کریم نے اس داستان کو زیادہ مفصّل اور مربوط انداز سے بیان کیا ہے۔ واضح رہے کہ ملوکیت سے مراد صرف وراثتی شہنشاہیت نہیں۔ بعض انسانوں کی دوسرے انسانوں پر حکومت، خواہ اس کی شکل کوئی بھی کیوں نہ ہو، ملوکیت کہلائے گی۔ چنانچہ دورِ حاضرہ کا جمہوری نظام جس میں عددی اکثریت کو اقلیت پر (بذریعہ قوانین ہی سہی) حکومت کرنے کا آئینی حق حاصل ہو جاتا ہے، ملوکیت ہی کی نگاہ فریب شکل ہے عصرِ حاضر کی سیاسی اصطلاح میں اسے سیکولر نظام کہا جاتا ہے۔

سورۃ القصص میں اس کشمکش کو نسبتاً زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس کی ابتداء ان الفاظ سے ہوتی ہے۔ اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ۔ (۲۸/۴) اس آیت میں "عَلَا" کا لفظ بڑا جامع ہے۔ اس میں تغلب و تسلط، سرکشی اور حدود فراموشی، ظلم و استبداد وغیرہ تمام مفاہیم آجاتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، حکومت فراعنہ اور ان کی قوم کے ہاتھ میں تھی اور قوم بنی اسرائیل ان کی محکوم تھی۔ ان کی تعداد بڑی کثیر تھی، سوال یہ ہے کہ ارباب اقتدار اتنی کثیر التعداد قوم کو اپنے زیرِ تسلط رکھنے کے لئے کرتے

فرعون کی حکمتِ عملی

کیا تھے؟ قرآنِ کریم نے ان کے اس حربے کو چند الفاظ میں اس ایجاز اور جامعیت کے ساتھ بیان کر دیا ہے کہ اس سے ملکیاتی سیاست کی پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے۔ وہ کرتا یہ تھا: وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا (۲۸/۴) " وہ اس قوم بنی اسرائیل کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کر دیتا تھا اور اس طرح ان کی اجتماعی قوت کو منتشر کر دیتا تھا" اس کے بعد يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ (۲۸/۴) " وہ ایک پارٹی کو اوپر اٹھاتا اور دوسری پارٹی کو دباتا۔ اور اس طرح اسے کمزور کر دیتا"۔ وہ مختلف پارٹیوں کی اس گردشِ دولابی سے، اس قوم کو بہ ہیئتِ مجموعی کمزور سے کمزور تر کئے جاتا۔ ان پارٹیوں کو اس طرح جھولا جھولاتے ہیں وہ یہ طریق اختیار کرتا کہ: يُذَبِّحُ اَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ (۲۸/۴) اس قوم کے جن لوگوں میں اسے جوہرِ مردانگی کی نمود دکھائی دیتی وہ انہیں خاص طور پر پست رکھتا اور ذلیل کرتا اور جو لوگ اس خصوصیت سے عاری ہوتے انہیں معزز اور مقرب بنا لیتا۔ اس طرح یہ ہیئتِ مجموعی وہ قوم آہستہ آہستہ خوشامد، تملق پیشگی، بزدلی، دوں ہمتی، منافقت اور خود اپنی قوم سے غداری کے انسانیت کش عیوب کی پیکر بنتی چلی جاتی۔ فرعون کے ان حربوں کی وضاحت کے بعد کہا کہ: اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ۔ (۲۸/۴) " وہ ان لوگوں میں سے تھا جو انسانی معاشرہ میں فساد برپا کرتے ہیں اور ہمواریاں پیدا نہیں ہونے دیتے" قرآنِ کریم نے مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ کہہ کر اس حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا کہ یہ صرف اسی کی خصوصیت نہیں تھی۔

فسادِ ملوکیت

ملوکیت جہاں بھی ہو، یہی کچھ کرے گی۔ اس کی وضاحت قرآنِ کریم نے دوسرے مقام پر کر دی ہے۔ وہاں کہا گیا ہے کہ جب حضرت سلیمانؑ نے ملکۂ سبا کے خلاف فوج کشی کی تو ملکہ نے اپنے اہلِ دربار سے مشورہ کیا کہ ہمیں کیا صورت اختیار کرنی چاہیئے۔ انہوں نے کہا کہ ہم دشمن کا مقابلہ کرنے کی سکت اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اس نے کہا کہ یہ تو ٹھیک ہے لیکن تمہیں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ: اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا (۲۷/۳۴) "جب بادشاہ کسی ملک میں فاتح کی حیثیت سے در آتے ہیں تو وہ وہاں فساد برپا کر دیتے ہیں"۔ وَجَعَلُوْا اَعِزَّةَ اَهْلِهَا اَذِلَّةً۔ " یعنی وہ وہاں کے اربابِ عزت و اقتدار کو ذلیل و خوار کر دیا کرتے ہیں۔ (۲۷/۳۴)۔ ان الفاظ نے فسادِ ملوکیت کی تشریح کر دی اور بتا دیا (کہ قصۂ فرعون میں) ذبحِ ابناءِ قوم اور استحیاءِ نساء کا سیاسی مفہوم کیا ہے۔ اس کے بعد ملکہ نے کہا۔ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ (۲۷/۳۴) " یہ بات اسی حملہ آور بادشاہ سے مخصوص نہیں۔ ملوکیت یہی کچھ کیا کرتی ہے۔

یہ ہے استبدادِ ملوکیت کا وہ عبرت آموز نقشہ جسے قرآن نے اس داستان کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے کہا۔ وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ۔ " ہماری مشیت نے یہ چاہا کہ جس بے کس اور بے بس قوم کو یوں کچلا جا رہا تھا اس پر احسان کریں"۔ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً۔ " انہیں پس ماندگی سے نکال کر صاحبِ قیادت بنا دیں"۔ وَنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ۔ " اور انہیں فرعون کی مملکت کے ایک حصے کا مالک بنا دیں"۔ وَنُمَكِّنَ

لَهُمْ فِي الْأَرْضِ۔ "اور ملک بھی اس انداز کا کہ وہاں انہیں پورا پورا اختیار اور اقتدار حاصل ہو"۔۔۔ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا مِنْهُم مَّا كَانُوا يَحْذَرُونَ (۲۸/۵-۶) "اور فرعون اور ہامان اور ان کے لاؤ لشکر کو وہ کچھ دکھا دیں جس کے دیکھنے سے وہ خائف تھے۔ جس کے تصوّر سے وہ کانپتے تھے اور اس سے محفوظ رہنے کے لئے طرح طرح کے حربے اختیار کرتے تھے"۔ ضمناً، یہاں قرآنِ کریم نے فرعون اور ہامان دونوں کے لشکروں کا ذکر کیا ہے۔ حکومت کے لشکر تو محسوس طور پر نظر آجاتے ہیں لیکن مذہبی پیشوائیت کے لشکر فوجی وردی میں نہیں ہوتے۔ وہ سارے معاشرہ میں (سفید کپڑوں میں) پھیلے ہوئے ہوتے ہیں اور کسی کو اس کا احساس تک بھی نہیں ہوتا کہ وہ حکومت کی فوج سے بھی زیادہ مؤثر، ذی اقتدار اور خطرناک ہیں۔

بہرحال یہ ہے صاحبِ ضربِ کلیمؑ اور فرعون کی وہ کشمکش جس کے اصولی خط و خال کو قرآنِ کریم نے اس جامعیت سے بیان کیا ہے۔ میں نے اسے اس تفصیل کے ساتھ اس لئے پیش کیا ہے کہ خود ہماری (برِصغیر کی) تاریخ کے ساتھ اس کی بڑی گہری مماثلت ہے۔ اور اس مماثلت کا بنیادی نقطہ وہ ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ "ہماری مشیّت کے پروگرام کا فیصلہ یہ ہوا کہ اس قوم پر احسان کیا جائے"۔ سوال یہ ہے کہ جس احسان کا یہاں ذکر کیا گیا ہے اس کی حقیقت کیا تھی؟ اس کا بنایت سمجھ لینا اس لئے بھی ضروری ہے کہ اسی قسم کا احسان خود ہم پر بھی ہوا ہے جس کا نتیجہ ہماری مملکت پاکستان ہے۔

ہم نے دیکھا ہے کہ فرعون اس قسم کے حربے استعمال کرتا تھا جس سے قوم بنی اسرائیل اس کی محکومیت کے شکنجے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جکڑی رہے۔ اس قوم کو بے شک بے دست و پا کر دیا گیا تھا۔ اس میں بلاشبہ وہ نقائص اور اسقام بھی پیدا ہو گئے تھے جو صدیوں کی غلامی اور محکومی کا فطری نتیجہ ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس کے دل میں اس غلامی اور محکومی کے خلاف ردِّعمل کا احساس موجود تھا۔ انسان جب تک انسان ہے اس قسم کا احساس اس کے دل میں موجود رہتا ہے خواہ اس کے مرئی آثار دکھائی نہ بھی دیں۔ قومِ بنی اسرائیل کے افراد کے دلوں میں یہ احساس موجود تھا اور رفتہ رفتہ تقویت پکڑتا جا رہا تھا۔ لیکن چونکہ ان کی زندگی انفرادی تھی، اجتماعی نہیں تھی۔ ان میں مرکزیت مفقود ہو چکی تھی۔ اس لئے استبدادِ ملوکیت کے خلاف ان کا ردِّعمل کوئی اجتماعی شکل اختیار نہیں کر پاتا تھا۔ ایسے وقت میں ان میں ایک بلند پایہ شخصیت (حضرت موسیٰؑ) کی نمود ہو گئی جو اس قوم کے بکھرے ہوئے شیرازے کا مرکز بن گئی اور اس نے ان کی انفرادیت کو اجتماعیت میں بدل دیا۔ علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کو چند اشعار میں بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں: ؎

آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ اِنَّ الْمُلُوْکَ — سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر — پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری!

جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری

اس کے بعد وہ کہتے ہیں:۔

خونِ اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں توڑ دیتا ہے کوئی "موسیٰ" طلسمِ سامری

یعنی محکوم قوم کے افراد کے دلوں میں پرورش پانے والا ردِ عمل تقویت اختیار کر لیتا ہے۔ اگر ایسے وقت میں کوئی دیدہ ور اور صاحبِ کردار شخصیت پیدا ہو جائے تو وہ ان کے اس جوش و جذبات کو نظم و ضبط کے ساحلوں میں محصور کر کے ان سے تعمیری نتائج پیدا کرا دیتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ سیلاب کی شکل اختیار کر کے ہر طرف تباہی مچا دیتی ہے۔ قوم بنی اسرائیل کی تاریخ میں حضرت موسیٰؑ کی بعثت ایسے ہی وقت میں ہوئی تھی۔ حصولِ مملکت اور اس میں تمکن اسی کا نتیجہ تھا۔ اسی شخصیت کی نمود تھی جسے اللہ تعالیٰ نے اپنا احسان کہہ کر پکارا ہے اور جس کے ہاتھوں مشیتِ ایزدی کے پروگرام (یعنی ارادۂ خداوندی) نے عملی شکل اختیار کر لی تھی۔ انسانی دنیا میں خدا کے ارادے انسانوں ہی کے ہاتھوں عملی شکل اختیار کیا کرتے ہیں۔ جب تک حضرات انبیاء کرامؑ کا سلسلہ جاری رہا، یہ خدائی پروگرام انہی کے ہاتھوں روبہ عمل ہوتا رہا۔ لیکن ختمِ نبوت کے بعد یہ سعادت اُمتِ مسلمہ کے سربرآوردہ افراد کے حصّے میں آئی تھی۔ اسی قسم کا احسانِ خداوندی ہم پر بھی ہوا۔ اور اسی کی وضاحت کے لئے میں نے اس پورے پس منظر کو آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔

یوں تو ہندوستان میں ہم ایک عرصہ سے لامرکزیت کا شکار تھے لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں ناکامی کے بعد ہمارا یہ ملی انتشار اپنی انتہا تک پہنچ گیا۔ مسلمانانِ ہند ایک قوم نہیں تھے خس و خاشاک کا ایک ڈھیر تھا جسے ہوا کا ہر تیز جھونکا جس طرف جی چاہے اڑا کر لے جاتا تھا۔ انگریز اور ہندو کی ملی بھگت نے اس قوم کو، جس نے ہزار سال تک اس ملک میں حکومت کی تھی، چند سالوں کے عرصہ میں اس پست ترین سطح تک پہنچا دیا جسے ڈاکٹر ہنٹر نے "ہیزم فروشوں اور مشکیزہ برداروں کے ٹولے" سے تعبیر کیا ہے۔ یہ تو تھی ان کی معاشی حالت۔ جہاں تک سیاسی پوزیشن کا تعلق ہے ۱۸۸۴ء میں ہندو اور انگریز نے مل کر انڈین نیشنل کانگریس کی طرح ڈالی جس کا عملی مفہوم یہ تھا کہ ہندوستان کے تمام باشندے وطن کے اشتراک کی بنیاد پر ایک قوم ہیں۔ یہ سازش مسلمانوں کے جداگانہ قومی تشخص کو ختم کر دینے کے لئے بروئے کار لائی گئی تھی۔ اس وقت مسلمانوں میں کوئی ایسا فرد دکھائی نہیں دیتا تھا جو اس کے خلاف آواز اٹھاتا تو ایک طرف اس کے مضمر خطرات کو بھانپ بھی سکتا۔ عین ایسے وقت میں خدا نے ہم پر احسان کیا اور ہم میں ایک ایسا جری اور دانا مرد پیدا کر دیا جسے سرسیّدؒ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ سرسیّدؒ کی پیدائش، پرورش، تعلیم، تربیت، مغلیہ دَور کے ماحول میں ہوئی۔ جس طرح (بلا تشبیہ) حضرت موسیٰؑ کی پرورش اور تربیت فرعون کے محلات میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد سرسیّدؒ نے انگریز کی ملازمت اختیار کی اور ملازمت بھی کسی بلند منصب کی نہیں، جس زمانے کی ہم بات کر رہے ہیں وہ اس وقت بنارس کے کمشنر کی کچہری میں (غالباً) اہلمد

سرسیّدؒ

تھے۔ تشکیلِ کانگریس کی سازش ہوئی تو دنیا یہ دیکھ کر دنگ رہ گئی کہ اسی سرسیدؒ نے انتہائی جرأت اور بسالت کے ساتھ اس کے خلاف آواز بلند کی اور مسلمانوں سے واضح الفاظ میں کہا کہ دیکھنا تم کہیں انگریز اور ہندو کے بچھائے ہوئے اس دامِ ہمرنگِ زمین میں گرفتار نہ ہو جانا۔ اس سے تمہارا جداگانہ قومی تشخص ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا۔ اس نے خود اپنے افسر، کمشنر سے بھی دو ٹوک الفاظ میں کہا کہ آپ اپنی قوم سے کہہ دیجئے کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دو مستقل بالذات قومیں ہیں انہیں ایک قوم میں مدغم کرنے کی اسکیم بڑے خطرناک نتائج پر منتج ہوگی۔ اس وقت میں اور آپ تو زندہ نہیں ہوں گے لیکن تاریخ میرے اس قول کی صداقت کی شہادت دے گا۔ سرسیدؒ کی اس جرأتِ رندانہ اور نعرۂ قلندرانہ نے قوم کے خوابیدہ احساسات میں زندگی کے آثار پیدا کر دیئے اور انہوں نے سمجھ لیا کہ ہم اس ملک میں ایک جداگانہ مستقل قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اسباب و علل کی کڑیوں کی رو سے کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا کہ ایسے حالات میں ہم میں سرسیدؒ جیسی شخصیت کی نمود کیسے ہو گئی؟ ہمیں لامحالہ اسے احسانِ خداوندی ہی سے تعبیر کرنا ہوگا۔

سرسیدؒ کے بعد پھر کوئی ایسی نمایاں شخصیت نظر نہیں آتی جو سرسیدؒ کے بلند کردہ نعرہ کو مستقل حیثیت عطا کر دیتی۔ علمی دنیا میں اقبالؒ ایک ابھرتا ہوا نوجوان نظر آتا تھا لیکن وہ اس زمانے میں اس قسم کے گیت گاتا تھا کہ:

اقبالؒ

خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

اور تشکیلِ قومیت کے متعلق کہتا تھا کہ[1]

ہم نے یہ مانا کہ مذہب جان ہے انسان کی — کچھ اسی کے دم سے قائم شان ہے انسان کی
رنگِ قومیت مگر اس سے بدل سکتا نہیں — خونِ آبائی، رگِ تن سے نکل سکتا نہیں

اقبالؒ وطن پرستی اور نسل پرستی کے یہ گیت گاتا ہوا انگلستان گیا جو اس زمانے میں نیشنلزم کا، یوں کہیئے کہ، سب سے بڑی آماجگاہ تھا۔ اقبالؒ گیا تو تھا یہ کہتا ہوا اور، یہ دیکھ کر انسانی آنکھ محوِ حیرت رہ جاتی ہے کہ وہ واپس آیا تو اس پیغام کو عام کرتا ہوا کہ:

بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

اور اس کے بعد اس نے اپنی بقیہ ساری عمر اس قرآنی تعلیم کے عام کرنے کے لئے وقف کر دی کہ اسلام میں معیارِ قومیت ایمان کا اشتراک ہے نہ کہ وطن کا۔ وہ وطن کو "تازہ خداؤں میں سب سے بڑا بت" قرار دیتے تھے۔

---

[1] علامہ اقبالؒ کے موجودہ مجموعہ کلام میں یہ اشعار نہیں ملتے۔ میں نے انہیں عزیز احمد کی کتاب "اقبالؒ نئی تشکیل" سے نقل کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علامہؒ نے انہیں بعد میں خود ہی حذف کر دیا۔ لیکن اس زمانے میں ان کے خیالات ایسے ہی تھے۔

اسباب وعلل کی کڑیاں پھر اس کی کوئی توجیہہ پیش نہیں کر سکتیں کہ اس صاحبِ نظر میں یہ انقلاب کس طرح پیدا ہو گیا؟ اقبالؒ نے اس نظریہ کے ساتھ ساتھ قرآنِ کریم کے اس ابدی پیغام کو بھی عام کیا کہ اسلام ایک زندہ حقیقت صرف اپنی ایک آزاد مملکت میں بن سکتا ہے اور دین کے اسی تقاضا کی بناء پر اس نے ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد کے مقام پر مسلمانوں کے لئے ایک آزاد جداگانہ مملکت کا مطالبہ پیش کر دیا۔ اُس وقت ملک کی حالت یہ تھی کہ قوم میں اس مطالبہ کا سیکنڈ کرنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ اور دانشورانِ قوم نے اسے ایک شاعر کے حسین خواب سے تعبیر کیا تھا۔ اقبالؒ کی نظروں میں بھی کوئی ایسی شخصیت نہیں تھی جو اس مطالبے کو عملی شکل دلوا سکے۔ مسلمان لیڈروں میں سب سے ممتاز حیثیت محمد علی جناحؒ کی تھی، لیکن جناحؒ کی کیفیت یہ تھی کہ وہ پارلیمان کے ایوان تک میں اعلان کرتا تھا کہ:-

I AM NATIONALIST, FIRST, NATIONALIST, SECOND, AND NATIONALIST, LAST.

جناحؒ

لیکن چشمِ تجسس یہ دیکھ کر ایک بار پھر محوِ حیرت رہ جاتی ہے کہ اقبالؒ کی سحر آفرینی نے اسی جناحؒ میں وہ تغیر پیدا کر دیا کہ وہ دو قومی نظریہ اور مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ مملکت کے مطالبے کا سب سے بڑا علمبردار بن کر سامنے آ گیا۔ کہیئے عزیزانِ من! کہ اگر ہم اسے خدا کا احسان کہہ کر نہیں پکاریں گے تو اور کیا کہیں گے؟ وہی احسان جس کے متعلق بنی اسرائیل کے ضمن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا: وَنُرِيدُ أَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ۔ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا مِنْهُم مَّا كَانُوا يَحْذَرُونَ۔ (۲۸/۵) تحریکِ پاکستان کی ساری تاریخ اس آیۂ جلیلہ کی حالیہ تفسیر ہے۔

(۰)

حضرت موسےٰؑ نے مطالبہ کیا کیا تھا؟ بس اتنا کہ: أَرْسِلْ مَعِيَ بَنِي إِسْرَائِيلَ۔ (۷/۱۰۵) "بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے۔ میں انہیں لے کر تم سے الگ ہو جانا چاہتا ہوں"۔ یہ علیحدگی کا مطالبہ تھا۔ یہی مطالبہ قائدِ اعظمؒ نے ہندو سے کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ میرا مطالبہ یہ ہے کہ جن علاقوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں، انہیں ہندوستان سے الگ کر دیا جائے تاکہ ہم وہاں اپنے تصور کی حکومت قائم کر سکیں۔ ہم وہاں آزاد ہوں، تم اپنے ہاں آزاد رہو۔ آپ غور کیجئے کہ یہ مطالبہ کس قدر معقولیت پر مبنی تھا، لیکن معقولیت اور ملوکیت تو دو متضاد چیزیں ہوتی ہیں۔ ملوکیت کی بنیاد ہی دھاندلی پر ہوتی ہے۔ اس لئے وہاں فرعون نے اور یہاں ہندو نے اس مطالبہ کی سخت مخالفت کی۔ ان کی ہوسِ اقتدار کا تقاضا ہی یہی تھا۔ اس لئے کہ اگر حکمران قوم محکوم قوم کو الگ ہو جانے دے تو پھر وہ حکومت کس پر کرے؟ چنانچہ قائدِ اعظمؒ کے اس مطالبہ کے خلاف ایک طوفان کھڑا ہو گیا اور انگریز کی پشت پناہی میں ہندوؤں نے قیامت برپا کر دی۔ کہیں راج گوپال اچاریہ نے یہ کہہ کر عوام کے جذبات کو مشتعل کیا کہ بھارت ہماری ماتا ہے۔ ہم

اپنی ماتا کے ٹکڑے نہیں ہونے دیں گے۔ کہیں گاندھی نے کہا کہ پاکستان میری لاش پر سے گذر کر ہی بن سکے گا۔ اور یہ مخالفت ایک دو دن نہیں، دس سال تک برابر جاری رہی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت موسےٰؑ یہ چاہتے تھے کہ جس انداز کی حکومت ایک خطے میں اہلِ فرعون کی ہے اسی قسم کی حکومت دوسرے خطے میں بنی اسرائیل کی قائم کی جائے گی۔ قطعاً نہیں۔ اگر مقصود یہی ہو تو پھر اس تبدیلی کو آسمانی انقلاب کیسے کہا جائے۔ آسمانی انقلاب کے معنی یہ ہیں کہ انسانوں کو دوسرے انسانوں کی محکومیت سے آزادی دلا کر انہیں صرف قوانینِ خداوندی کا پابند بنایا جائے۔ اس حقیقت کو حضرت موسےٰؑ نے دو الفاظ میں نہایت جامعیت سے واضح کر دیا تھا۔ جب فرعون نے حضرت موسیٰؑ پر اپنے احسانات گنانے شروع کئے تو آپ نے کہا کہ تم اپنے سب سے بڑے احسان کو کیوں نہیں گناتے..... اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ۔ (۲۶/۲۲) "یہ احسان کہ تم نے بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنا رکھا ہے۔" اس کے برعکس، وہ جو تبدیلی چاہتے تھے یہ تھی کہ انہیں انسانوں کی غلامی سے نکال کر خدا کی غلامی میں دیدیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے فرعون سے کہا تھا۔ اَنْ اَدُّوْٓا اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰہِ (۴۴/۱۸) "تم اللہ کے بندوں کو میری طرف لوٹا دو۔" ان چار لفظوں میں دو عظیم نکات پوشیدہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہاں فرعون سے عَبَّدْتَّ کہا۔ یعنی تمہارے غلام۔ اور یہاں انہیں عِبَادَ اللّٰہِ کہا۔ یعنی اس تبدیلی سے یہ مقصود نہیں کہ بنی اسرائیل فرعون کی غلامی سے نکل کر میری (حضرت موسیٰؑ کی) غلامی میں آجائیں۔ مقصد یہ ہے کہ وہ کسی انسان کی غلامی میں نہ رہیں بلکہ خالصتاً خدا کی غلامی میں آجائیں۔ اور دوسرے یہاں اَدُّوْٓا کہا۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کی اصل تو یہ ہے کہ وہ کسی انسان کا غلام اور محکوم نہ ہو۔ صرف قوانینِ خداوندی کا پابند ہو۔ لیکن مستبد انسان اُسے اپنا محکوم بنا لیتے ہیں۔ اُسے انسانوں کی غلامی سے چھڑانے کے معنی یہ ہیں کہ اسے اس کی اصلی حالت کی طرف لوٹا دیا جائے۔

مطالبۂ پاکستان کا مقصود

اسی قسم کا انقلاب مطالبۂ پاکستان کا مقصود و مطلوب و منتہیٰ تھا۔ جب مولانا حسین احمد مدنیؒ (مرحوم) نے علامہ اقبالؒ سے کہا کہ کانگریس کے پیشِ نظر ہندوستان کو انگریز کی غلامی سے آزاد کرانا ہے تو آپ اُس کے ساتھ تعاون کیوں نہیں کرتے۔ تو انہوں نے جواب میں کہا تھا کہ:-

> مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کو ختم کرنا ہمارا فرض ہے لیکن اس آزادی سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں بلکہ ہمارا اوّل مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقتور بن جائیں۔ اس لئے مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہو سکتا جس کی بنیادیں انہی اصولوں پر ہوں جن پر انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنا چہ معنی دارد؟ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد تک دار الاسلام بن جائے لیکن اگر آزادئ ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دار الکفر ہے ویسا ہی رہے یا اس سے بھی بدتر بن جائے تو مسلمان ایسی آزادئ وطن پر ہزار مرتبہ

لعنت بھیجتا ہے۔ وہ ایسی آزادی کی راہ میں لکھنا، بولنا، روپیہ صرف کرنا، لاٹھیاں کھانا، جیل جانا، گولی کا نشانہ بننا، سب کچھ حرام اور قطعی حرام سمجھتا ہے۔

(علامہ اقبالؒ کا بیان مولانا مدنیؒ کے جواب میں)

یہ علامہ اقبالؒ نے کہا اور اس کے بعد قائدِ اعظمؒ واضح تر الفاظ میں اس کی تصریح کرتے چلے گئے کہ مسلمانوں کی جس آزاد مملکت کے لئے ہم کوشاں ہیں اس کی خصوصیت کیا ہوگی۔ انہوں نے اگست ۱۹۴۱ء میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد (دکن) کے طلباء کے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ:-

مملکتِ پاکستان کی خصوصیت

اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں عملاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی کا نام ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہوتی ہے۔

(بحوالہ اورینٹ پریس آف انڈیا)

آپ نے غور فرمایا کہ یہ وہی، انسانوں کی غلامی سے نکال کر خدا کی غلامی میں لانے کے کلیمی الٰہی نعرہ کی صدائے بازگشت تھی ——— دین شروع سے اخیر تک ایک چلا آرہا ہے۔ جہاں بھی دینِ خالص کی آواز بلند ہوگی اس میں کوئی تضاد نہیں ہوگا۔

(۰)

اب آیئے داستانِ بنی اسرائیل اور تحریکِ پاکستان کی مماثلت کے اگلے نکتہ کی طرف۔ فرعون نے پہلے حضرت موسےٰؑ سے براہِ راست بات کی لیکن جب دیکھا کہ اس کی دال نہیں گلتی تو اس نے مذہبی پیشوائیت کے نمائندہ ہامان سے کہا کہ وہ اپنے لاؤ لشکر سمیت آئے اور حضرت موسیٰؑ سے مقابلہ کرے۔ تحریکِ پاکستان میں ہندو نے بھی یہی روش اختیار کی۔ اس نے قائدِ اعظمؒ کے ساتھ پہلے براہِ راست ٹکر لی، لیکن جب دیکھا کہ ان کے دلائل کا کوئی جواب ان کے پاس نہیں تو انہوں نے اسی پرانے حربے سے کام لیا اور مسلمانوں کی مذہبی جماعتوں کو آگے بڑھا دیا کہ وہ "خدا اور رسول" کے نام پر عوام کے جذبات کو مشتعل کریں اور اس طرح پاکستان کے مطالبہ کو ناکام بنا دیں۔ علمائے دیوبند کی سب سے بڑی نمائندہ جماعت جمعیت علماء ہند، جس کے اُس زمانہ کے صدر، مفتی محمود صاحب کے استاد اور

مذہبی پیشوائیت کی طرف سے مخالفت

پیر و مرشد مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) تھے۔ ان کے علاوہ مجلسِ احرار اور انصار پارٹی بھی اس معرکہ میں ہمدوش تھے۔ انہوں نے کس کس انداز سے تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی اور کس

اس قسم کے زہر میں بجھے ہوئے نشتر اس تحریک کے حامیوں کے سینوں میں پیوست کئے، میں اس کی تفصیل گذشتہ تیس برس سے پیش کرتا چلا آ رہا ہوں، اس لئے اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ انتہا یہ تھی کہ مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) اور مجلسِ احرار کے ممتاز لیڈر مولانا مظہر علی اظہر نے قائدِ اعظمؒ کو "کافرِ اعظم" تک کا خطاب دیا اور مسلم لیگ میں مسلمانوں کی شرکت کو قطعی غیر اسلامی اور حرام ٹھہرایا۔ (حوالوں کے لئے دیکھئے میرا پمفلٹ "مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی"۔ جو اگست ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا تھا)۔

اس مقام پر، داستانِ بنی اسرائیل اور تحریکِ پاکستان میں ایک اور مماثلت کا ذکر بھی ناگزیر ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، بنی اسرائیل کے ساتھ سامری بھی وادیٔ سینا میں آ گیا تھا جہاں اس نے اس قوم میں تفرقہ انگیزی کے نہایت مقدس حربے استعمال کئے تھے، اسی طرح تقسیمِ ہند کے وقت، بہت سے سامری ہندوستان سے پاکستان کی طرف منتقل ہو کر آ گئے جہاں انہوں نے سامریت کے فتنوں کو برابر جگائے رکھا اور قوم کو ایک دن بھی چین سے جینے نہیں دیا۔ بہرحال، میں کہہ یہ رہا تھا کہ مسلمانوں کی مذہبی پیشوائیت کی طرف سے مطالبۂ پاکستان کی مخالفت ہوئی اور سخت مخالفت۔

(۰)

اس مخالفت کے ہجوم میں میں نے ابھی تک اس جماعت اور اس کے بانی کا نام نہیں لیا جن کی طرف سے مخالفت انتہا تک پہنچ گئی تھی اور جنہوں نے تقسیمِ ہند کے وقت، بلکہ اس کے بعد تک بھی اس میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ یہ تھی جماعتِ اسلامی اور اس کے بانی ابوالاعلیٰ مودودی صاحب۔ ان کی طرف سے مخالفت کی تفاصیل بھی شرح و بسط سے، اور خود ان کی تحریروں کے حوالوں سے پیش کرتا چلا آ رہا ہوں اس لئے ان کے اعادہ کی بھی چنداں ضرورت نہیں ـــ لیکن حال ہی (نومبر ۱۹۷۸ء) میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا ہے جس کی بناء پر اس کا از سرِ نو پیش کرنا ضروری محسوس ہوتا ہے۔ باقی جماعتوں نے جنہوں نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی تھی، حصولِ پاکستان کے بعد اس کا اعتراف کیا کہ انہوں نے اس تحریک کی مخالفت کی تھی لیکن تشکیلِ پاکستان کے بعد انہوں نے اس کی مخالفت نہیں کی۔ ـــ (مفتی محمود صاحب نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ وہ پاکستان کو قائم کرنے کے گناہ میں شامل نہیں تھے۔ (روزنامہ مشرق۔ مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۷۷ء) ـــ لیکن اس کے برعکس مودودی صاحب نے ایک عجیب روش اختیار کی۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی ہی نہیں۔ دنیا اس پر حیران تھی کہ تحریکِ پاکستان کی مخالفت میں شائع کردہ مودودی صاحب کا ضخیم لٹریچر ابھی تک موجود ہے۔ اس کی موجودگی میں وہ یہ کہنے کی جرأت کس طرح کر سکتے ہیں کہ انہوں نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت نہیں کی تھی۔ لیکن مودودی صاحب اور ان کی جماعت برابر کہتی رہی اور کہے چلی جا رہی ہے کہ انہوں نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت نہیں کی تھی۔

یہ داستان پرانی ہونے کی وجہ سے کچھ فراموش سی ہو گئی تھی کہ اس جماعت کے حالیہ امیر میاں طفیل محمد صاحب

نے حال ہی میں اس کا باندازِ نو اعادہ فرمایا ہے۔ انہوں نے ۲۳ نومبر کی شب، پاکستان ٹیلی ویژن پر اپنے ایک انٹرویو میں (اس سوال کے جواب میں کہ جماعتِ اسلامی نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت کیوں کی تھی) فرمایا کہ یہ الزام قطعاً غلط ہے اور اصل واقعات خود اس کی تردید کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۴۱ء میں جماعتِ اسلامی کی تشکیل کے بعد جماعت کے اس زمانے کے سیکرٹری قائدِ اعظمؒ کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ تقسیمِ ملک کا آپ کا مطالبہ بجا اور درست، لیکن اگر یہ مطالبہ منظور بھی کر لیا گیا تو اس سے اسلامی مملکت وجود میں نہیں آسکے گی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے "پیدائشی مسلمانوں" کو حقیقی مسلمان بنایا جائے۔ ان کی ذہنیت کو بدلا جائے۔ ان کی سیرت و کردار کو اسلامی سانچے میں ڈھالا جائے۔ یہ وہ مسلمان ہوں گے جن سے اسلامی مملکت وجود میں آسکے گی۔ اس پر قائدِ اعظمؒ نے فرمایا کہ جو کچھ آپ کہتے ہیں بالکل صحیح ہے لیکن مسلمانوں کے اندر قلب و دماغ کے اس قسم کے تغیر اور سیرت و کردار کی اس قسم کی تبدیلی کے لئے تو صدیاں درکار ہوں گی۔ اور یہاں حالت یہ ہے کہ ہندوستان کی بساطِ سیاست پر اس تیزی سے تغیرات رونما ہو رہے ہیں کہ اگر میں اس ذہنی تبدیلی کے کام میں لگ گیا تو انگریز، پورے کے پورے ملک کو ہندوؤں کے حوالے کر کے چلا جائے گا۔ اور مسلمان انگریز کی غلامی سے نکل کر ہندوؤں کی غلامی کے شکنجے میں جکڑا جائے گا جو انگریز کی غلامی سے بھی بدتر ہوگی۔ انہوں نے فرمایا کہ مناسب یہ ہوگا کہ میں تقسیمِ ہند کی لڑائی لڑتا رہوں اور آپ ذہنی اور اخلاقی تبدیلی کے لئے کوشش کرتے رہیں۔ اس طرح یہ دونوں متوازی تحریکیں ایک ہی منزل کی طرف رواں دواں رہیں۔ میاں صاحب نے فرمایا کہ قائدِ اعظمؒ اور جماعتِ اسلامی میں اس مفاہمت کے بعد کیا کوئی باور کر سکتا ہے کہ مودودی صاحب نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی تھی؟

میاں طفیل محمدؒ صاحب کا بیان

یہ تھا اس سوال کا جواب جو میاں طفیل محمدؒ صاحب نے ٹیلیویژن پر دیا۔ واضح رہے کہ اس انٹرویو کا تحریری ریکارڈ شائع نہیں ہوا۔ جو کچھ اوپر کہا گیا ہے یہ میاں صاحب کے جواب کا ملخص یا مفہوم ہے جسے ہزاروں لاکھوں انسانوں نے سنا تھا۔

اس مبینہ مفاہمت کا کوئی ریکارڈ نہ مسلم لیگ کے ضخیم لٹریچر میں ملتا ہے (اور جہاں تک میری نگاہ یاوری کرتی ہے) نہ ہی جماعتِ اسلامی کے لٹریچر میں اس کا کہیں ذکر ہے۔ نہ ہی میاں صاحب نے اس کا کوئی حوالہ دیا ہے۔ یہ مبینہ واقعہ پیش آیا جماعتِ اسلامی کے اس زمانے کے سیکرٹری جنرل اور قائدِ اعظمؒ کے درمیان۔ غالباً اس کا کوئی تیسرا شاہد بھی نہیں تھا۔ قائدِ اعظمؒ اس وقت دنیا میں موجود نہیں جو اس کی تائید یا تردید کرتے۔ نہ ہی مودودی صاحب یا جماعتِ اسلامی نے اسے قائدِ اعظمؒ کی زندگی میں کبھی بیان کیا۔ مودودی صاحب نے آج تک اپنے کسی بیان میں اس مفاہمت کا ذکر نہیں کیا۔ لہٰذا، اس کی تائید یا تردید میں قرائن کی رُو سے ہی کچھ کہا جا سکتا ہے۔ قرائن اس کی شہادت دیتے ہیں کہ نہ تو قائدِ اعظمؒ نے جماعتِ اسلامی کے ساتھ اس قسم کی کوئی مفاہمت کی تھی ـــــ وہ اس قسم کی مفاہمتوں

کے قائل ہی نہیں تھے۔ اور نہ ہی مودودی صاحب نے کبھی مسلم لیگ اور جماعتِ اسلامی کو ایسی متوازی تحریکیں قرار دیا تھا جو ایک ہی منزل کی طرف رواں دواں تھیں۔ اس خاکسار کو تحریکِ پاکستان کے دوران قائداعظمؒ اور مسلم لیگ کے دیگر زعماء کے ساتھ ہم رکابی کی سعادت حاصل رہی ہے۔ ان میں سے کسی نے کبھی اس (مبینہ) مفاہمت کا ذکر تو ایک طرف، اس کی طرف اشارہ تک بھی نہیں کیا تھا۔ اس زمانے کے طلوع اسلام کے فائل بھی محفوظ ہیں۔ ان میں اس قسم کے اہم واقعہ کا ذکر ضرور آنا چاہیئے تھا۔ لیکن وہاں بھی ہمیں اس کی طرف اشارہ تک نہیں ملتا۔ قوم کی بدقسمتی سے، تحریکِ پاکستان کی کوئی مصدقہ یا مستند تاریخ مرتب نہیں ہوئی لیکن (ایک عینی شاہد کی حیثیت سے) میں نے اپنا یہ فریضہ قرار دے رکھا ہے کہ اس تحریک کے متعلق جہاں کوئی خلافِ واقعہ بات کہی جائے، میں اس کی تردید یا تصحیح کر دوں۔ میری یہی وہ ذمہ داری ہے جس کی بنا پر میں ضروری سمجھتا ہوں کہ میاں طفیل محمدؐ صاحب کے اس بیان کا جائزہ لے کر، اصل حقیقت قوم کے سامنے پیش کر دوں۔ مجھے اس سلسلہ میں بہت سے استفسارات موصول ہوئے ہیں جن میں مجھ سے تقاضا کیا گیا ہے کہ میں حقیقت کی وضاحت کروں۔ یاد رہے کہ میاں صاحب کا یہ بیان آج تو محض ایک اخباری خبر کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن مستقبل میں یہی خبر تاریخ کا حصہ اور حقائق کو مسخ کرنے کا موجب بن جائے گی۔ اس بنا پر بھی اس بیان کا جائزہ لینا ضروری قرار پا جاتا ہے۔ اس قسم کے فریضہ کی ادائیگی میرے لئے کوئی خوشگوار امر نہیں۔ لیکن اس احساس سے کہ ایسے مواقع پر خاموش رہنے سے میں کتمانِ شہادت کے جرم کا مرتکب قرار پا جاؤں، اپنے آپ کو اس کے لئے مجبور پاتا ہوں کہ:

اگر خاموش بنشینم گناہ است

(۰)

میاں صاحب کے بیان کی رو سے یہ واضح ہے کہ:-

۱۔ اس مفاہمت کے مطابق جب یہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ تحریکِ پاکستان اور جماعت اسلامی دو متوازی تحریکیں ہیں جن کا مقصود و مطلوب ایک ہی ہے تو پھر جماعتِ اسلامی کو مسلم لیگ کی مخالفت نہیں کرنی چاہیئے تھی بلکہ اس کے حلیف کی حیثیت سے کام کرنا چاہیئے تھا۔ ہمیں دیکھنا یہ ہوگا کہ کیا جماعتِ اسلامی تحریکِ پاکستان اور قائداعظمؒ کی حلیف کی حیثیت سے سرگرم عمل رہی تھی یا ان کے شدید ترین دشمن کی حیثیت سے اس کی مخالفت میں مصروف۔

۲۔ جب یہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ ملک کی تقسیم خود جماعتِ اسلامی کے مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے —— یعنی ایک اسلامی مملکت کے قیام کا ذریعہ —— تو مودودی صاحب کو تقسیم ہند کے مطالبہ کی تائید کرنی چاہیئے تھی۔ دیکھنا یہ ہوگا کہ کیا مودودی صاحب نے تقسیمِ ملک کی تائید کی تھی یا وہ آخر تک اس مطالبہ کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہے تھے۔

میں ان ہر دو دفعات کے متعلق اپنی طرف سے کچھ نہیں کہوں گا۔ مودودی صاحب اور جماعتِ اسلامی کے دیگر زعماء کی تحریریں پیش کر دوں گا جو خود اس کی شہادت پیش کر دیں گی کہ میاں صاحب کا یہ بیان کس قدر

حقیقت پر مبنی ہے۔

---(۰)---

مطالبۂ پاکستان کا مطلب

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ قائداعظمؒ نے تحریکِ پاکستان کے دوران مطلوبہ مملکت کا مقصد کیا بیان کیا تھا۔ یعنی وہ اس مملکت کے حصول کی جدوجہد کیوں کر رہے تھے۔

مودودی صاحب کے ماہنامہ ترجمان القرآن کی اشاعت بابت مئی ۱۹۷۸ء میں، ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے ــــ پاکستان کی نظریاتی اساس۔ دعویٰ اور عمل ــــ اس میں، جماعتِ اسلامی کا ایک مشہور رہنما، پروفیسر خورشید احمد صاحب کی کتاب ــــ پاکستان میں آئین کی تدوین اور جمہوریت کا مسئلہ ــــ کے حوالوں سے کہا گیا ہے۔

بانیٔ پاکستان، قائداعظمؒ محمد علی جناح مرحوم نے تقسیم ملک سے قبل، نظریۂ پاکستان کی ان الفاظ میں وضاحت کی تھی۔

(i) پاکستان کا منشاء و مقصد صرف آزادی اور خودمختاری نہیں بلکہ اسلامی نظریہ ہے جو ایک بیش بہا عطیہ اور خزانے کی حیثیت سے ہم تک پہنچا ہے۔ جس کو ہمیں قائم اور برقرار رکھنا ہے اور جس کی بابت ہمیں توقع ہے کہ دوسرے بھی اس سے متمتع ہوں گے۔

(جون ۱۹۴۵ء)

(ii) مسلمان پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں تاکہ وہ اپنے ضابطۂ حیات، اپنی روایات اور اسلامی قوانین کے مطابق حکومت کر سکیں جو ہمیں خودمختاری حاصل کرنے کے لئے آگے بڑھاتے ہیں۔

(نومبر ۱۹۴۰ء)

(iii) لیگ اس بات کی دعویدار ہے کہ ہندوستان کے ان علاقوں میں جہاں مسلمان تعداد کے لحاظ سے اکثریت میں ہیں، ایسی مملکت قائم کریں جہاں وہ اسلامی قوانین کے تحت حکومت کر سکیں۔

(دسمبر ۱۹۴۰ء)

(iv) ہمارے وجود کی اساس اسلام ہے۔ ہم ایک ہیں اور ہمیں ایک قوم کی حیثیت سے آگے بڑھنا چاہیئے۔ یہی صورت ہے جس سے ہم پاکستان کو قائم رکھ سکتے ہیں۔ (مارچ ۱۹۴۳ء)

حصولِ پاکستان کے بعد قائداعظمؒ نے فرمایا:۔

اس اسکیم کے پیش کرنے میں بنیادی اصول میرے پیش نظر تھا۔ یعنی اسلامی جمہوریت کا اصول۔ میرا یہ ایمان ہے کہ ہماری نجات اسی میں مضمر ہے کہ ہم ان بیش بہا اصولوں کی پیروی کریں جو ہمارے عظیم المرتبت قانون دہندہ، پیغمبرِ اسلام نے وضع فرمائے تھے۔

ان اقتباسات کے درج کرنے کے بعد، صاحب مقالہ لکھتے ہیں:۔

یہ تھا وہ نظریۂ پاکستان جسے قائدِاعظمؒ نے بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کیا تھا۔ جس کی

دعوت پر برِصغیر کے مسلمان جمع ہوئے تھے۔ (ایضاً - ص۲۸)

اس حقیقت کا اعتراف، خود مودودی صاحب کن الفاظ میں کرتے ہیں، وہ بھی سننے کے قابل ہیں — انہوں نے اپنے ایک بیان میں جو نوائے وقت کی اشاعت بابت ۱۴ اگست ۱۹۶۱ء میں چھپا تھا، فرمایا تھا:-

اس تحریک کے آغاز سے ہی عام مسلمان یہ سمجھ رہے تھے کہ ان کی تمناؤں کا مرکز پاکستان ایک اسلامی ملک ہوگا جس میں اسلام کا قانون جاری ہوگا اور اسلامی تہذیب زندہ کی جائے گی۔ اس لئے ان کا نعرہ یہ تھا کہ — پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الٰہ الا اللہ — مسلم لیگ کے لیڈر بھی اپنی تقریروں میں یہی خیال ظاہر کر رہے تھے۔ اور سب سے بڑھ کر خود قائدِ اعظم مرحوم و مغفور نے مسلمانوں کو یقین دلایا تھا کہ پاکستان کا دستور قرآنی ہوگا۔

مودودی صاحب کی طرف سے مخالفت

آپ نے سن لیا کہ مودودی صاحب اعلان فرما رہے ہیں کہ تحریکِ پاکستان کے دوران قائدِ اعظمؒ اور مسلم لیگ کے دیگر لیڈرؒ واضح الفاظ میں کہتے تھے کہ پاکستان ایک اسلامی ملک ہوگا اور اس میں اسلام کا قانون جاری ہوگا۔ لیکن تحریکِ پاکستان کے دوران آپ یہ کہتے تھے کہ:-

مسلم لیگ کے کسی ورزولیشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمع نظر پاکستان میں اسلامی نظام حکومت قائم کرنا ہے۔ (مودودی صاحب کی کتاب۔ مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش۔ حصہ سوم۔ شائع کردہ۔ مکتبہ جماعتِ اسلامی۔ دارالاسلام۔ جمال پور۔ پٹھانکوٹ۔ ص۱۳۰)

آپ مودودی صاحب کے ان ہر دو بیانات کو آمنے سامنے رکھئے اور پھر سوچئے کہ اس قسم کے کھلے ہوئے تضاد کی مثال آپ کو کہیں اور بھی ملتی ہے؟

اتنا ہی نہیں۔ اس زمانے میں مودودی صاحب یہ بھی فرماتے تھے کہ:-

افسوس کہ لیگ کے قائدِ اعظمؒ سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہو۔ (ایضاً - ص۳۷)

انہوں نے تحریکِ پاکستان کے قائدین سے برملا کہا تھا کہ:-

اگر یہ آپ کی قومیت ہے اور یہ آپ کا کلچر ہے اور یہ آپ کے قومی مقاصد ہیں تو آپ اپنی قوم کا جو نام چاہیں تجویز فرما لیں۔ اسلام کا نام استعمال کرنے کا آپ کو حق نہیں ہے۔ (ایضاً - ص۴۶)

پھر کہا:-

یہ لوگ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں شوق سے کریں۔ ہم ان کا راستہ روکنے نہیں آئے۔ ہمارا مطالبہ

ان سے صرف یہ ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے نام کو غلط طریقے پر استعمال کرنا چھوڑ دیں۔
(ایضاً۔ ص۸۳)

لیگ کے لیڈر تو ایک طرف، وہ وہاں کے مسلمانوں کو مسلمان ہی نہیں سمجھتے تھے۔ وہ انہیں اور غیر مسلموں کو ایک ہی صف میں شمار کرتے تھے۔ چنانچہ جب انہوں نے ۱۹۴۱ء میں اپنی جماعت کی بنیاد رکھی تو یہ اعلان فرمایا تھا کہ:-

اس جماعت میں کوئی شخص اس مفروضے پر شامل نہیں کر لیا جائے گا کہ جب وہ مسلمان گھر میں پیدا ہوا ہے اور اس کا نام مسلمانوں کا سا ہے تو وہ ضرور مسلمان ہوگا...... جو شخص یہ سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے بعد کلمۂ شہادت کہنے کی جرأت کرے صرف وہی اس جماعت میں داخل ہو سکتا ہے خواہ وہ نسلاً غیر مسلم ہو اور ابتداءً یہ شہادت ادا کرے یا پیدائشی مسلمان ہو اور اب پورے فہم اور شعور کے ساتھ اپنے سابق ایمان کی تجدید کرے۔
(ایضاً۔ ص۱۵-۲۱۴)

انہوں نے ان مسلمانوں کے متعلق صاف صاف کہہ دیا کہ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ وہ باقی رہیں یا نہ رہیں۔ ان کے الفاظ ہیں:-

اگر ہندوستان کے مسلمانوں نے دین سے بے بہرہ لوگوں کی قیادت میں، ایک بے دین قوم کی حیثیت سے اپنا علیحدہ وجود برقرار رکھا بھی (جیسا کہ ترکی اور ایران میں برقرار رکھے ہوئے ہیں)، تو ان کے اس طرح زندہ رہنے میں اور کسی غیر مسلم قومیت کے اندر فنا ہو جانے میں آخر فرق ہی کیا ہے۔
(ایضاً۔ ص۸۳)

ہم محترم میاں طفیل محمد صاحب سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ جس جماعت کے ساتھ مودودی صاحب نے (بقول ان کے) مفاہمت کی تھی، کیا اس کے متعلق ان کا یہ رویہ ہونا چاہیئے تھا؟ شاید کہہ دیا جائے کہ مودودی صاحب نے ایسا کچھ مفاہمت سے پہلے کہا تھا، تو کیا میاں صاحب بتائیں گے کہ مفاہمت کے بعد مودودی صاحب نے مسلم لیگ، اس کے قائدین اور اس کے مؤید مسلمانوں کے حق میں کوئی کلمۂ خیر کہا تھا؟ یہی نہیں، ایک قدم آگے بڑھیئے۔ (میاں صاحب کے ارشاد کے مطابق) مفاہمت یہ تھی کہ قائداعظمؒ مملکت حاصل کر لیں اور مودودی صاحب ان میں بسنے والے افراد کی اخلاقی اصلاح کریں۔ جب قائداعظمؒ نے مملکت حاصل کر لی تو اس سے گویا وہ مقصد حاصل ہو گیا جس کے لئے وہ مفاہمت کی گئی تھی۔ اس پر تو مودودی صاحب کو چاہیئے تھا کہ قائداعظمؒ کو مبارکباد دیتے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس پر مودودی صاحب نے کیا فرمایا تھا؟ انہوں نے تحریک پاکستان کے متعلق تفصیلی بحث کرنے کے بعد لکھا تھا:-

یہ بحث ان سب لوگوں کا منہ کالا کر دینے والی ہے جنہوں نے پچھلے ربع صدی میں ہماری سیاسی تحریکوں کی قیادت فرمائی ہے۔
(ترجمان القرآن۔ بابت جون ۱۹۴۸ء۔ ص۴)

انہوں نے اس پر یہ اضافہ بھی فرمایا تھا کہ:-

یہ ساری جماعت بازیگروں سے بٹی پڑی تھی جنہوں نے عجیب قلا بازیاں کھا کر دنیا کو اپنی سیرت اور کھوکھلے اخلاق کا تماشا دکھایا اور اس قوم کی رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا دی جس کے وہ نمائندہ بنے ہوئے تھے۔ (ترجمان القرآن - اگست ۱۹۴۸ء - ص۳)

حال ہی میں میاں طفیل محمدؒ صاحب اور غفور احمد صاحب نے ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن سرگودھا کے اجتماع میں ایک سوال کے جواب میں کہا تھا کہ:-

مولانا مودودی اور خود انہوں نے قائدِ اعظمؒ کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی تھی۔ ان سے جب پوچھا گیا کہ کیا مولانا مودودی نے بھی قائدِ اعظمؒ کو اپنا قائد تسلیم کیا تھا تو یہ جواب دیا گیا کہ مولانا مودودی خود قائد ہیں اس لئے وہ قائدِ اعظمؒ کو اپنا قائد کیوں مانتے؟

(مساوات - ۲۷ فروری ۱۹۷۸ء)

ان تصریحات سے بھی آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ قائدِ اعظمؒ کے ساتھ مودودی صاحب کے تعلقات ایک حلیف کے سے تھے یا ایک حریف کے سے؟

———(۰)———

اب ہم اس مبینہ مفاہمت کی بنیادی شق کی طرف آتے ہیں۔ میاں صاحب نے فرمایا ہے کہ اس مفاہمت کی رو سے طے یہ پایا تھا کہ تقسیم ملک کی تحریک قائدِ اعظمؒ چلائیں اور اصلاحِ معاشرہ مودودی صاحب کی ذمہ داری رہے۔ ہم نے دیکھنا یہ ہے کہ کیا مودودی صاحب تقسیم ملک کے حق میں تھے یا اس کے خلاف تھے۔ جیسا کہ آپ دیکھیں گے وہ تقسیم ہند کے سخت خلاف تھے لیکن اس باب میں ان کی ٹیکنیک دوسروں سے الگ تھی۔ انگریز، ہندو اور نیشنلسٹ علماء کا مؤقف یہ تھا کہ جب ہندوستان کی جمہوری حکومت میں مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی تو پھر ان کے لئے ایک جداگانہ مملکت کی ضرورت کیا ہے؟ مسلم لیگ کی طرف سے اس کے جواب میں ان سے کہا یہ جاتا تھا کہ مشترکہ وطن میں مسلمانوں کو جس قسم کی آزادی حاصل ہوگی وہ عقائد، رسمی عبادات یا شخصی قوانین تک محدود ہوگی لیکن اسلام کا اپنا ضابطۂ حیات ہے، جس پر صرف اپنی آزاد مملکت میں عمل پیرا ہوا جا سکتا ہے۔ اس مقصد کے لئے مسلمانوں کو ایک الگ خطۂ زمین کی ضرورت ہے۔ مودودی صاحب کا ارشاد یہ تھا کہ اسلام واقعی مکمل ضابطۂ حیات ہے لیکن اسے ایک چھوٹے سے خطۂ زمین میں سمٹانا غیر اسلامی تصور ہے۔ ہمیں سارے ہندوستان میں اسلامی مملکت قائم کرنی چاہیئے۔ اس لئے تقسیم ملک کی تحریک غیر اسلامی ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ مودودی صاحب بھی تقسیم ہند کے خلاف تھے لیکن ان کی پیش کردہ توجیہہ کس قدر مغالطہ آفریں تھی؛

سارا ہندوستان اسلامی مملکت

اس ضمن میں مودودی صاحب کی کتاب "مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش حصہ سوم" (جس کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے) کے چند ایک اقتباسات ملاحظہ فرمایئے۔ وہ کہتے تھے:-

مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لئے اس مسئلہ میں بھی کوئی دلچسپی نہیں کہ ہندوستان میں جہاں

مسلمان کثیر التعداد ہیں وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے۔ (ص ۹۳)

صرف پاکستان ہی نہیں ساری دنیا میں :-

ایک حقیقی مسلمان ہونے کی حیثیت سے جب میں دنیا پر نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے اس امر پر اظہارِ مسرّت کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ترکی پر ترک، ایران پر ایرانی اور افغانستان پر افغان، حکمران ہیں۔ (ص ۹۲)

اس سے ذرا آگے چل کر :-

مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری نگاہ میں اس سوال کی بھی کوئی اہمیت نہیں کہ ہندوستان ایک ملک رہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے۔ تمام روئے زمین ایک ملک ہے۔ انسان نے اس کو ہزاروں حصّوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ..... مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے نزدیک یہ امر بھی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا کہ ہندوستان کو انگریزی امپریل ازم سے آزاد کرایا جائے۔ (ص ۹۴)

اس سے بھی واضح تر الفاظ میں وہ کہتے تھے کہ :-

نہ ہندوؤں سے ہمارا کوئی قومی جھگڑا ہے نہ انگریزوں سے وطنیت کی بنیاد پر ہماری لڑائی ہے۔ نہ ان دو ریاستوں سے ہمارا کوئی رشتہ ہے جہاں نام نہاد مسلمان خدا بنے بیٹھے ہیں۔ نہ اقلیت کے تحفظ کی ہمیں ضرورت ہے۔ نہ اکثریت کی بنیاد پر قومی حکومت مطلوب ہے۔ ہمارے سامنے تو صرف ایک مقصد ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ کے بندے اللہ کے سوا کسی کے محکوم نہ ہوں بندوں کی حاکمیت ختم ہو جائے اور حکومت اس قانونِ عدل کی قائم ہو جو اللہ نے خود بھیجا ہے۔ (ص ۱۱۰)

اس پر ان سے کہا جاتا کہ اللہ کی حاکمیت قائم کرنے کی اوّلین اور بنیادی شرط یہ ہے کہ مسلمانوں کے پاس ایک خطۂ زمین ہو جس میں اللہ کی حاکمیت قائم کی جا سکے۔ اس لئے مطالبۂ پاکستان اسی بلند و بالا مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے تو اس کے جواب میں وہ کہتے :-

بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز ہی کا سہی، مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ قائم تو ہو جائے۔ پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعہ سے اس کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مگر میں نے تاریخ۔ سیاسیات اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اس کی بنا پر میں اس کو ناممکن سمجھتا ہوں۔ (ص ۱۶۸)

انہوں نے واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ اس قسم کی حکومت "ہمارے مقصد کے لئے نہ صرف غیر مفید ہو گی بلکہ کچھ زیادہ ہی سدِّ راہ ثابت ہو گی"۔ (ترجمان القرآن - بابت محرم ۱۳۶۰ھ)

ان اقتباسات سے واضح ہے کہ مودودی صاحب مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کے قیام کے لئے ایک الگ خطۂ زمین کے حصول کے سخت خلاف تھے۔ وہ کہتے یہ تھے کہ :-

آج جو لوگ اسلام کے تحفظ کی بس یہی ایک صورت دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو ہر طرف سے سمیٹ کر چند گوشہ ہائے عافیت میں پہنچا دیا جائے۔ افسوس ہے کہ وہ اسلام کے (ان) امکانات سے ناواقف ہیں۔ (سیاسی کشمکش حصہ سوم ۔ صفحہ ۵۸)

انہوں نے ۲۵ راپریل ۱۹۴۷ء کو مدراس میں اپنی ایک تقریر کے دوران فرمایا کہ اگر مسلمانانِ ہند تحریکِ پاکستان کے بجائے اس دعوت کو قبول کر لیتے جو وہ دے رہے تھے۔

تو آج ہندوستان کی سیاست کا نقشہ بالکل بدلا ہوا ہوتا اور دو چھوٹے چھوٹے پاکستانوں کی جگہ سارے ہندوستان کے پاکستان بن جانے کے امکانات ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتے۔ (روداد جماعتِ اسلامی حصہ پنجم۔ شائع کردہ مکتبہ جماعتِ اسلامی۔ ذیلدار پارک اچھرہ۔ لاہور ۔ صفحہ ۱۲۰)

جیساکہ اوپر کہا گیا ہے۔ مودودی صاحب نے یہ تقریر اپریل ۱۹۴۷ء میں مدراس میں کی تھی۔ اس پس منظر کا سمجھ لینا بھی مفید ہوگا۔ مودودی صاحب نے تحریکِ پاکستان کے سارے دور میں تقسیم ہند کی مخالفت کی لیکن اس کے باوجود ۱۹۴۷ء کے آغاز میں تقسیم کا مسئلہ طے پاگیا تو انہوں نے ان صوبوں کا رُخ کیا جہاں مسلمان اقلیت میں تھے تاکہ یہ کہہ کر پاکستان بننے کے بعد ہندوستان میں تمہارا کیا حشر ہوگا، ان کے جذبات کو مشتعل کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے ٹونک، مدراس اور پٹنہ میں جماعت کے خصوصی اجلاس منعقد کئے۔ مدراس کے اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا:۔

ہندو اکثریت کے علاقے میں مسلمان عنقریب یہ محسوس کر لیں گے کہ جس قوم پرستی پر انہوں نے اپنے اجتماعی رویہ کی بنیاد رکھی تھی وہ انہیں بیابانِ مرگ میں لاکر چھوڑ گئی ہے اور ان کی قومی جنگ جسے وہ بڑے جوش و خروش سے بغیر سوچے سمجھے لڑ رہے تھے ایک ایسے نتیجے پر ختم ہوئی ہے جو ان کے لئے تباہی کے سوا اپنے اندر کچھ نہیں رکھتا۔ (مذکورہ بالا روداد ۔ صفحہ ۱۱۳)

ان تصریحات کی روشنی میں کیا کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ مودودی صاحب نے قائدِ اعظمؒ کے ساتھ اس امر کی مفاہمت کر لی تھی کہ قائدِ اعظمؒ تقسیم ہند کی لڑائی لڑیں اور مودودی صاحب اصلاحِ اخلاق کی کوشش کریں اور اس طرح یہ دونوں متوازی تحریکیں آخر الامر ایک منزل تک پہنچ جائیں۔ اگر کسی کو اس میں اب بھی کوئی شبہ ہو تو وہ دو ایک اقتباسات مزید ملاحظہ فرما لیں جو اس باب میں قولِ فیصل کا حکم رکھتے ہیں۔ ٹانک کے اجلاس میں ایک صاحب نے مودودی صاحب سے کہا کہ جب مسلم لیگ کا مطالبہ مسلمانوں کے لئے ایک اسلامی مملکت حاصل کرنے کا ہے تو پھر کونسا امر مانع ہے کہ ہم اس کا ساتھ نہ دیں۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب نے فرمایا:۔

جب آپ ایک تحریک کو خود غیر اسلامی مان رہے ہیں تو پھر کس منہ سے ایک مسلمان سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ اس کا ساتھ دیا جائے۔ جن مسائل اور مصائب کا اس قدر رونا رویا جا رہا ہے یہ مسائل اور مصائب سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتے اگر مسلمان اسلام کے فی الواقعہ سچے نمائندے ہوتے۔ اور اگر

مسلمان اب بھی سچے مسلمان بن جائیں تو آج ہی یہ سارے مسائل ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ ہندوستان کے ایک ذرا سے کونے میں پاکستان بنانے کو اپنا انتہائی مقصد بنائے ہوئے ہیں۔ لیکن اگر یہ فی الواقعہ خلوصِ قلب سے ہندوستان کی نمائندگی کے لئے کھڑے ہو جائیں تو سارا ہندوستان پاکستان بن سکتا ہے۔ (مذکورہ بالا روئداد۔ صـ۶۵)

پٹنہ کے اجلاس میں ملک نصر اللہ خان صاحب نے بھی خطاب کیا (وہ اب مرحوم ہو چکے ہیں) انہوں نے کہا:

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اقامتِ دین کے آغاز سے پہلے زمین کا ایک قطعہ حاصل کر لینا ضروری ہے جہاں دین کو برپا کر سکیں۔ حیرت ہے کہ یہ چیز خاصے سمجھدار اور بظاہر معقول اور عالمِ دین، لوگوں تک کی طرف سے کہی جاتی ہے ..... حکومت کے قیام کے لئے آپ کو اینٹ اور گارے کی ضرورت نہیں کہ آپ قطعاتِ زمین تاکتے پھریں۔ (ایضاً۔ صـ۱۵۴)

فرمائیے! اس کے بعد بھی یہ سمجھنے کے لئے کسی اور سند کی ضرورت ہے کہ جماعتِ اسلامی مطالبۂ پاکستان کی مخالف تھی۔ اس جماعت کی طرف سے اس مطالبہ کی مخالفت کے سلسلے میں صرف ایک واقعہ کا مزید ذکر کر دینا کافی ہوگا۔ تحریکِ پاکستان کی تاریخ میں ۱۹۴۵-۴۶ء کا زمانہ نازک ترین دور تھا۔ انگریز اور ہندو نے ایک اسکیم مرتب کی جس کی رو سے فیصلہ کیا گیا کہ ملک میں الیکشن کرائے جائیں۔ اگر اس کے نتیجے میں،

۱۹۴۵-۴۶ کے الیکشن

مسلم لیگ کو اکثریت حاصل ہو گئی تو اس کے مطالبۂ پاکستان کو حق بجانب تسلیم کر لیا جائے گا۔ ورنہ اسے مسترد کر دیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ تحریکِ پاکستان کے لئے یہ فیصلہ کن مرحلہ تھا۔ اس قدر فیصلہ کن کہ قائدِ اعظمؒ نے پاکستان ڈے ۱۹۴۵ء کی تقریب پر قوم کے نام اپنے پیغام میں کہا تھا کہ:-

یاد رکھو! اگر ہم اس جدوجہد میں ناکام رہ گئے تو نہ صرف یہ کہ ہم تباہ ہو جائیں گے بلکہ اس برِصغیر میں مسلمانوں اور اسلام کا نام و نشان تک باقی نہیں رہے گا۔

ایسے نازک وقت میں جب مودودی صاحب سے پوچھا گیا کہ مجوزہ الیکشن کے بارے میں آپ کا موقف کیا ہوگا تو انہوں نے جواب میں کہا کہ:-

ووٹ اور الیکشن کے معاملہ میں ہماری پوزیشن صاف صاف ذہن نشین کر لیجئے۔ پیش آمدہ انتخاب یا آئندہ ہونے والے انتخابات کی اہمیت جو کچھ بھی ہو اور ان کا جیسا کچھ بھی اثر ہماری قوم یا ملک پر پڑتا ہو، بہرحال ایک با اصول جماعت ہونے کی حیثیت سے ہمارے لئے یہ ناممکن ہے کہ کسی وقتی مصلحت کی بناء پر ہم ان اصولوں کی قربانی گوارا کر لیں جن پر ہم ایمان لائے ہیں۔

(اخبار کوثر۔ مورخہ ۲۸ اکتوبر ۱۹۴۵ء)

کیا اس کے بعد بھی یہ کہا جا سکے گا کہ جماعتِ اسلامی مطالبۂ پاکستان کے حق میں تھی اور اس باب میں اس کی قائدِ اعظمؒ کے ساتھ مفاہمت ہو چکی تھی۔

یہ پھر بھی ذرا دور کی باتیں ہیں۔ پچھلے سال پاکستان ٹائمز کے نمائندہ نے مودودی صاحب کا ایک انٹرویو لیا

جس میں اس نے ان سے پوچھا کہ انہوں نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت کیوں کی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کے جواب میں میاں طفیل محمدؒ صاحب کے قول کے مطابق انہیں یہ کہنا چاہیئے تھا کہ ہماری تو قائدِ اعظمؒ کے ساتھ مفاہمت ہوگئی ہوئی تھی اس لیئے ہم ان کی مخالفت کیوں کرتے۔ لیکن انہوں نے اس کے بجائے یہ کہا کہ:۔

ہمارے لئے اصل بات یہ ہے کہ اگر ہمیں ایک گز زمین ایسی مل جائے جہاں خدا کی مشیت کا غلبہ ہو تو وہ خطّہ دوسروں سے زیادہ مقدّس ہوگا۔ ہم چاہتے تھے کہ پورا ہندوستان سرزمینِ اسلام ہو لہٰذا ہم اسلام کے نام پر حاصل کئے جانے والے ملک کی مخالفت کس طرح کر سکتے تھے؟ لیکن جو لوگ تحریکِ پاکستان کی صفِ اوّل میں شامل تھے۔ وہ ہمیں سچے مسلمان نظر نہیں آتے تھے۔ ہمارے دلوں میں اس تحریک کے متعلق شکوک کی یہ وجہ تھی۔ ہم قائدِ اعظمؒ کے ہی خلاف نہیں تھے۔ ہم اس پوری کی پوری قیادت کے خلاف تھے جو تحریکِ پاکستان کو چلا رہی تھی۔

(پاکستان ٹائمز۔ مورخہ ۲۵ ستمبر ۱۹۷۷ء)

ہم اس مقام پر اس منطقی الجھاؤ کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتے جو اس بیان کی رو سے پیدا کیا گیا ہے۔ ہم کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ مودودی صاحب قائدِ اعظمؒ سمیت جس قیادت کے اس قدر سخت مخالف تھے، وہ ان سے مفاہمت کس طرح کر سکتے تھے؟

یہ تو پھر بھی دو سال پہلے کی بات تھی۔ ۲۵ دسمبر ۱۹۷۵ء کے نوائے وقت میں مودودی صاحب کا ایک انٹرویو شائع ہوا ہے۔ اس میں ان سے سوال کیا گیا کہ آپ نے پاکستان کے قیام (تقسیمِ ہند) کی مخالفت کیوں کی تھی۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا:۔

اس سلسلہ میں، میں اپنے مؤقف کا بارہا اظہار کر چکا ہوں۔ میں نے پاکستان کے مطالبہ کی اس بنیاد کو کبھی غلط نہیں کہا کہ جس علاقہ میں مسلمانوں کی اکثریت آباد ہے اسے مسلمانوں کا قومی وطن مانا جائے اور متحدہ ہندوستان کی ایک آزاد حکومت کے بجائے ہندو ہندوستان اور مسلم ہندوستان کی دو آزاد حکومتیں قائم ہوں۔

مسلمانوں کی ایک الگ مملکت کی مخالفت میں مودودی صاحب جو کچھ کہتے تھے وہ سابقہ صفحات میں ہمارے سامنے آچکا ہے۔ اس کی روشنی میں یہ حقیقت اُبھر کر ہمارے سامنے آسکتی ہے کہ مودودی صاحب کا مذکورہ بالا بیان کس قدر حقیقت اور صداقت پر مبنی ہے؟ ہم اس سلسلہ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتے۔

(۰)

یہاں تک بات مودودی صاحب کے بیانات تک محدود تھی۔ لیکن اب ہمارے سامنے خود میاں طفیل محمدؒ صاحب کے ہاتھوں کی ایک ایسی تحریر آئی ہے جو آئینے کی طرح بات واضح کر دیتی ہے۔ پاکستان مسلم لیگ (زمانہ قبل از تقسیم) کے ایک سابق اکاؤنٹنٹ، مقصود رضا خان صاحب، کا ایک مقالہ ہفت روزہ ذوالفقار کی اشاعت بابت ۱۳ نومبر ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا ہے۔ اس میں انہوں نے کہا ہے کہ ۱۹۴۴ء کا ذکر ہے کہ مسلم لیگ نے یہ کوشش کی کہ بعض علماء اور دوسرے ممتاز مسلمان جو مسلم لیگ سے علیحدہ تھے اس میں شامل ہو جائیں۔ اس غرض سے

بعض صاحبان کو بطورِ اتمامِ حجت دعوت دی گئی تھی اور بعض مسائل پر ان کی رائے حاصل کرنے کی غرض سے ایک سوال نامہ بھی ارسال کیا گیا تھا۔ سوالنامہ سید غلام مرتضیٰ صاحب (جی۔ ایم۔ سیّد) کی طرف سے شائع ہوا تھا جو اس زمانے میں آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی، کونسل اور کمیٹی آف ایکشن کے ممبر اور سندھ صوبائی مسلم لیگ کے صدر تھے۔ اس سلسلے میں ایک خط مودودی صاحب کو بھی بھیجا گیا تھا۔ اس خط کا جو جواب مودودی صاحب نے ارسال فرمایا وہ میاں طفیل محمد صاحب کے قلم سے لکھا گیا تھا۔ مقصود رضاخان صاحب نے اس خط کا فوٹو مذکورہ بالا ہفت روزہ میں شائع کیا ہے۔ اس خط پر ۲۰/۹/۶۳ (ہجری) کی تاریخ ثبت ہے جو انگریزی کیلنڈر کے حساب سے ستمبر ۱۹۴۴ء کے پہلے ہفتے کی تاریخ بنتی ہے۔ اس خط کا متن حسبِ ذیل ہے :-

بقلم میاں صاحب

مکرمی و محترمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

عنایت نامہ ملا۔ سید غلام مرتضیٰ صاحب کی طرف سے جو سوالنامہ آیا تھا اس کا جواب میں دے چکا ہوں۔ نیز دہلی سے بعض اصحاب نے جو تحریر اس سلسلہ میں بھیجی تھی ان کے سامنے بھی میں نے اپنا نقطہ نظر واضح کر دیا تھا۔ اگر آپ میرے ان جوابات کو ملاحظہ فرمائیں تو آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا کہ دہلی حاضر ہو کر میں کوئی خاص خدمت انجام نہیں دے سکوں گا۔ علاوہ بریں میں ایک بات اور بھی صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں۔ مسلم لیگ کی قیادت اس وقت جن اصحاب کے ہاتھ میں ہے ان کے طرزِ عمل سے صریح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ ان کے اندر اسلام کی پیروی کا قطعاً کوئی ارادہ موجود نہیں ہے بلکہ مسلمانوں میں زیادہ سے زیادہ جو لوگ اسلام سے منحرف ہیں وہ بھی مسلم لیگ کے موجودہ لیڈروں کی آزادروی پر رشک کر سکتے ہیں اس کے بعد جب ہم مسلم لیگ کی طرف سے اس قسم کی آوازیں سنتے ہیں کہ "مسلمانوں میں صحیح اسلامی روح پیدا کی جائے اور ان تمام غیر اسلامی رسوم و افکار کا استیصال کرنے کے لئے جو مسلمانوں میں رائج ہو گئی ہیں مؤثر ذرائع اور طریق کار تجویز کئے جائیں" اور ان مقاصد کے لئے کمیٹیاں مقرر کی جاتی ہیں۔ تو ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ مسلمانوں میں اس قیادت کا اعتبار جمانے کی ایک منافقانہ کوشش ہے اور یہ محسوس ہونے کے بعد پھر اس کوشش میں حصہ لینے کو کسی طرح ضمیر گوارا نہیں کرتا۔ گو یہ میری دلی خواہش ہے کہ میں مسلمانوں میں جو کام بھی کسی صحیح مقصد کے لئے صحیح طرز پر ہو رہا ہو اس میں حصہ لوں اور جو کچھ بھی چھوٹی یا بڑی خدمت مجھ سے بن آئے سرانجام دوں، لیکن مسلمانوں کو فریب میں مبتلا کرنے کی کسی کوشش میں یہ صاف جانتے ہوئے تعاون کرنا ممکن نہیں ہے۔

(بالفاظ سید ابوالاعلیٰ مودودی)

خاکسار طفیل محمد۔ قیم جماعتِ اسلامی۔ برائے سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب

—— (۰) ——

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے یہ خط خود میاں طفیل محمد صاحب کے قلم کا لکھا ہوا ہے۔ ہم اس باب میں کچھ نہیں

کہنا چاہیئے۔ قارئین خود فیصلہ کر لیں کہ اس کی روشنی میں میاں صاحب کا یہ بیان کس حد تک صحیح قرار پا سکتا ہے کہ مسلم لیگ اور جماعت اسلامی میں باہمی مفاہمت ہو چکی تھی، اور یہ دونوں تحریکیں متوازی حیثیت سے ایک مشترکہ نصب العین کی طرف گامزن تھیں۔

(۰)

اخلاقی اصلاح

میاں طفیل محمدؐ صاحب کی بیان کردہ مفاہمت کی رُو سے قائدِ اعظمؒ کے ذمے تقسیم ہند کی لڑائی لڑنا تھی اور مودودی صاحب کے ذمے مسلمانوں کے اخلاق کی اصلاح۔ لیکن آپ دیکھئے کہ اس باب میں مودودی صاحب نے کیا فرمایا تھا۔ تشکیل پاکستان کے بعد ان کے ماہنامہ ترجمان القرآن کا پہلا پرچہ جون ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ انہوں نے اس میں تحریکِ پاکستان پر تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا:۔

> پچھلے دس سال کی قومی تحریک میں اسلام کا نام جس قدر لیا گیا اس کا پچاسواں حصہ بھی مسلمانوں کے اندر اسلامی اخلاق پیدا کرنے کے لئے کام نہیں کیا گیا۔ بلکہ ان کے قومی اخلاق کو پہلے سے کچھ زیادہ ہی پست کر دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ قومی جنگ میں مسلمان ان تمام اخلاقی جرائم کے مرتکب ہوئے جن کا ارتکاب ان کے حریفوں نے کیا۔ مظالم کی مقدار میں چاہے کتنا ہی فرق ہو مگر مظالم کی نوعیت میں دونوں کے کارنامے ایک دوسرے سے کچھ مختلف نہ رہے۔ اگر ہماری قومی قیادت نے ہمارے عوام کی اخلاقی تربیت کے لئے کوئی کوشش کی ہوتی اور اکثریت کے علاقوں کے مسلمان وہ حرکات نہ کرتے جو انہوں نے کیں، تو اقلیت کے مسلمان اس بُری طرح نہ پیسے جاتے اور آج پاکستان کی اخلاقی پوزیشن ہندوستان سے اتنی زیادہ اونچی ہوتی کہ ہندوستان اس سے آنکھ ملا کر بات نہ کر سکتا۔

سوال یہ ہے کہ جب مبینہ مفاہمت کی رو سے اصلاحِ اخلاق کی ذمہ داری مودودی صاحب کی تھی تو پھر قائدِ اعظمؒ سے بازپرس کیوں کی جا رہی تھی کہ انہوں نے اصلاحِ اخلاق کے لئے کچھ نہ کیا۔ اس مفاہمت کی رُو سے، جو فریضہ قائدِ اعظمؒ کے ذمے عائد کیا گیا تھا (یعنی تقسیم ہند کا فریضہ) انہوں نے اسے نہایت حسن و خوبی سے سرانجام دیا اور مسلمانوں کے لئے ایک الگ خطۂ زمین حاصل کر لیا۔ اس کے برعکس جو ذمہ داری مودودی صاحب نے اپنے سر پر لی تھی (یعنی اصلاحِ اخلاق کی ذمہ داری) اس میں وہ خود اپنے الفاظ کے مطابق، بُری طرح ناکام رہے، اور بجائے اس کے کہ وہ اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے اس کے لئے بھی قائدِ اعظمؒ کو موردِ الزام قرار دے دیا۔ اس بات کو تو چھوڑیئے کہ ہندوستان میں اس جماعت نے اصلاحِ اخلاق کے لئے کیا کام کیا، خود پاکستان میں دیکھئے کہ انہوں نے معاشرہ کی کس حد تک اصلاح کی۔ یہاں یہ جماعت منظم حیثیت سے مسلسل سرگرم عمل چلی آ رہی ہے۔ روپے پیسے کی بھی انہیں کوئی کمی نہیں۔ تبلیغ اور نشر و اشاعت کے ذرائع بھی انہیں میسّر ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس سب کے باوجود اس تیس سال کے عرصہ میں انہوں نے اصلاحِ اخلاق کے لئے کیا کیا اور اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ اس کے متعلق ہم سے نہیں، خود میاں طفیل محمد صاحب

سے پوچھئے۔

اصلاحِ معاشرہ کے لئے جماعتِ اسلامی نے اپنے طور پر کیا کیا اس کا تو کسی کو علم نہیں، البتہ قومی اتحاد کی طرف سے نومبر ۱۹۷۸ء کے آخری عشرہ میں اصلاحِ معاشرہ کے لئے ایک تحریک چلائی گئی تھی۔ اس کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے، میاں طفیل محمد صاحب نے فرمایا:۔

> آج ہم پاکستان میں نیکی کو فروغ دینے اور برائی کو ختم کرنے کی ملک گیر تحریک کا آغاز کر رہے ہیں۔ یہ تحریک اللہ کے لئے ہے اور اللہ کی طرف سے ہم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم اس تحریک میں حصہ لیں اور اجتماعی اور انفرادی طور پر اپنی اصلاح کریں۔ (ایشیا۔ مورخہ ۳ دسمبر ۱۹۷۸ء)

یعنی تشکیلِ پاکستان کے تیس سال کے بعد اصلاحِ معاشرہ کی تحریک کا آغاز ہوتا ہے، اور وہ بھی جماعتِ اسلامی کی طرف سے نہیں بلکہ قومی اتحاد کی طرف سے جس میں شامل جماعتوں میں سے ایک جماعتِ اسلامی ہے۔ یہ تحریک کس حد تک کامیاب یا مؤثر ہوئی اس کے متعلق میاں صاحب نے طبی کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

> جب تک یہاں مومنوں کا معاشرہ قائم نہیں ہوتا، ملک کے اندر اسلامی نظام کا نفاذ قابلِ عمل نہ ہوگا... ..... پاکستان قومی اتحاد نے اصلاحِ معاشرہ کی جو مہم چلائی ہے اگر قومی اتحاد میں پہلے کی طرح ساری جماعتیں شامل ہوتیں تو یہ مہم زیادہ مؤثر ثابت ہوتی۔ (نوائے وقت بابت ۷ دسمبر ۱۹۷۸ء)

اس سلسلہ میں ہم اس سے زیادہ اور کیا عرض کر سکتے ہیں کہ:۔

خزاں تو موردِ الزام ہی سہی، لیکن ۔۔۔ یہ فیضِ بادِ صبا بھی تو گل کہیں نہ کھلے

(۱)

اس مقام پر ایک اور نکتہ بھی قابلِ غور ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، تحریکِ پاکستان کے خلاف مودودی صاحب کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ یہ لوگ اسلام کو ایک خطۂ زمین میں سمٹا دینا چاہتے ہیں۔ اس کے برعکس ہمارے پیشِ نظر سارے ہندوستان کو دارالاسلام بنا دینا ہے۔ یہ بہت مبارک تھا ان کا یہ خیال۔ لیکن سوال یہ ہے کہ تشکیلِ پاکستان کے بعد وہ اس خطۂ زمین کی طرف منتقل ہو کر کیوں آگئے جہاں اسلام کو سمٹا کر رکھ دیا گیا تھا۔ سارے ہندوستان کو دارالاسلام بنانے کے لئے وہیں کیوں نہ رہے۔ اس کے جواب میں شاید یہ کہہ دیا جائے کہ تقسیمِ ہند کے بعد اس علاقے میں مسلمانوں کی کثیر آبادی نہیں رہی تھی اس لئے ہم وہاں نہ رہے۔ لیکن تحریکِ پاکستان کے دوران تو آپ یہ فرمایا کرتے تھے کہ:۔

> یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ اس تحریک (یعنی سارے ہندوستان کو دارالاسلام بنانے کی تحریک) کو اٹھانے اور پھیلانے کے لئے خارج میں کسی سامان اور ماحول میں کسی سازگاری کی ضرورت ہے۔ دراصل خارج میں نہیں بلکہ مسلمان کے اپنے باطن میں ایمان کی ضرورت ہے۔ اس قلبی شہادت کی ضرورت ہے کہ یہی مقصد حق ہے اور اس عزم کی ضرورت ہے کہ میرا جینا اور مرنا اسی مقصد کے لئے ہے۔ یہ ایمان۔ یہ شہادت۔ یہ عزم موجود ہو تو دنیا بھر میں ایک اکیلا انسان یہ اعلان کرنے کے لئے کافی

ہے کہ میں زمین پر خدا کی بادشاہت قائم کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی پشت پر کسی منظم اقلیت یا کسی حکومتِ خود اختیاری رکھنے والی اکثریت کی کوئی حاجت نہیں۔

(مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش۔ حصہ سوم۔ صفحہ ۱۰۴)

اور آپ یہ بھی کہتے تھے کہ:۔

اگر اسلام ایک زندہ عملی تحریک کی حیثیت سے میدان میں آجائے اور اس کے اصولوں کی بنیاد پر ہندوستانی زندگی کے حقیقی مسائل کو حل کرنے کے لئے ایک عملی پروگرام لے کر کوئی منظم جماعت اُٹھ کھڑی ہو تو یقین رکھیئے اس کا اپیل پیدائشی مسلمانوں تک محدود نہ رہے گا بلکہ شاید ان سے بڑھ کر غیر مسلموں کو اپنی طرف کھینچے گا اور کوئی طاقت اس سیلِ رواں کو نہ روک سکے گی ......

اسلام کو حکمران بنانے کے لئے حقیقی مسلمانوں کی کسی بڑی تعداد کی ضرورت نہیں۔ تھوڑے سے ہی کافی ہیں۔ بشرطیکہ علم اور عمل کے اعتبار سے مسلمان ہوں اور خدا کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرنے پر مستعد ہوں۔ (ایضاً۔ صفحہ ۵۹ - ۵۸)

جب آپ کے نزدیک صورتِ حال یہ تھی تو پھر یہ سوال بار بار اُبھر کر سامنے آجاتا ہے کہ آپ پورے ہندوستان کو دار الاسلام بنانے کے عظیم مقصد کو چھوڑ کر ادھر کیوں تشریف لے آئے۔ اور دوسرا سوال یہ کہ جماعتِ اسلامی ہندوستان میں بھی تو موجود ہے اس نے اس تیس سال کے عرصہ میں اس ملک کو کس حد تک دار الاسلام بنا لیا ہے۔

(۰)

مَیں اپنے اس خطاب کو مودودی صاحب کے اس انٹرویو کے ایک اقتباس پر ختم کرنا چاہتا ہوں جو نوائے وقت کی ۲۵ دسمبر ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ ان سے سوال کیا گیا کہ "آپ کے متعلق عام طور پر کہا جاتا ہے کہ آپ نے قائدِ اعظمؒ اور تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی۔ کیا آپ اس سلسلہ میں کچھ وضاحت کریں گے؟" اس کے جواب میں انہوں نے کہا:۔

شخصی بحث میں اُلجھے بغیر اتنا ہی کہنا کافی سمجھتا ہوں کہ میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد جب سے ملکی سیاست میں دلچسپی لینی شروع کی تھی میرے دل میں جن لیڈروں کا احترام سب سے زیادہ تھا ان میں سے ایک قائدِ اعظمؒ مرحوم بھی تھے۔ میں نے ان کو ہمیشہ ایک با اصول۔ راستباز اور مضبوط سیرت و کردار کا مالک انسان سمجھا اور ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کبھی میرے دل میں ان کے متعلق یہ بدگمانی پیدا نہیں ہوئی کہ وہ اپنے ضمیر کے خلاف بھی کوئی بات کر سکتے ہیں۔

مودودی صاحب نے انہی قائدِ اعظمؒ کے متعلق ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک جو کچھ کہا تھا وہ سابقہ صفحات میں آپ کے سامنے آچکا ہے۔ اس ضمن میں مَیں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ قائدِ اعظمؒ کی عظمتِ کردار کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ جو لوگ انہیں عمر بھر ہدفِ ملامت بناتے رہے وہ بھی اب ان کی پاکیزگیٔ سیرت کے احترام میں اپنے آپ کو سر جھکانے پر مجبور پاتے ہیں۔ حسنِ صداقت کی خصوصیت یہ ہے کہ جوں جوں زمانہ گذرتا ہے اس میں اور نکھار پیدا ہوتا جاتا ہے۔ بقول غالب ؎

قدرِ شعرِ من بگیتی بعد من خواہد شدن ۔۔۔ ایں مے از قحطِ خریداراں کہن خواہد شدن

(۰)

نتیجہ جیسا کہ آپ نے (اس خطاب) سے دیکھ لیا، میاں طفیل محمد صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ قائداعظمؒ اور مودودی صاحب کے مابین اس امر پر مفاہمت ہوگئی تھی کہ قائداعظمؒ اسلامی مملکت کیلئے خطۂ زمین حاصل کرنے کیلئے جدوجہد کریں اور مودودی صاحب پیدائشی مسلمانوں کو سچے مسلمان بنانے کی مہم جاری رکھیں اور اس طرح یہ دونوں تحریکیں متوازی حیثیت سے ایک دوسرے کی حلیف بن کر مصروف کار رہیں۔ میاں صاحب نے فرمایا ہے کہ یہ مفاہمت اسلامی جماعت کے اس زمانے کے سیکرٹری جنرل (پروفیسر قمرالدین خان) کی وساطت سے عمل میں آئی تھی۔ یہ خطاب چھپ گیا تو پروفیسر قمرالدین خان کا ایک مقالہ ہمارے سامنے آیا جو کراچی سے شائع ہونے والے روزنامہ ڈان (انگریزی) کی ۲۹ اگست ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ اس میں انہوں نے "اس واقعہ" کا بھی ذکر کیا ہے۔ ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اس خطاب کے ساتھ، اس مقالہ کا متعلقہ حصہ بھی شائع کر دیا جائے تاکہ اصل حقیقت قارئین کے سامنے آجائے۔ پروفیسر صاحب لکھتے ہیں:

(تحریک پاکستان کے دوران) کچھ اہم تحریکی قوتیں، مثل خاکسار تحریک اور جماعت اسلامی بھی مصروف کار تھیں۔ قائداعظمؒ نے انہیں بھی مسلم لیگ میں سمونے کی کوشش کی۔ اس مقصد کیلئے انہیں لیگ میں شامل ہونے کی دعوت دی، اور اس کی بھی اجازت دے دی کہ وہ اپنی تنظیموں کو لیگ کے ذیلی اداروں کی شکل میں باقی رکھ لیں۔ ان کے ساتھ گفتگو، راجہ صاحب محمود آباد کے توسط سے ہوئی تھی۔ میں ان امور سے بخوبی واقف ہوں کیونکہ میں اس زمانہ (۱۹۳۹-۴۲ء) میں راجہ صاحب کا ایک قریبی دوست تھا اور لیگ کے پراپیگنڈہ کے سلسلہ میں ان کے دوروں اور لیکچروں میں ان کے ساتھ رہتا تھا۔ علامہ مشرقی (مرحوم) کے ساتھ اس گفتگو کا سلسلہ، منصب (STATUS) کے نقطہ پر آکر ٹوٹ گیا۔ وہ لیگ کی قیادت کے تحت کام کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔

جہاں تک مولانا مودودی کا تعلق ہے، میں ان کا ذاتی نمائندہ تھا۔ مسلم لیگ کا مدراس کا اجلاس قریب آرہا تھا۔ مودودی صاحب کو میری وساطت سے، لیگ سیشن سے خطاب کرنے کی (زبانی) دعوت دی گئی۔ راجہ صاحب ممدوح نے ان کے اخراجات برداشت کرنے کا ذمہ لیا۔ عین وقت پر مودودی صاحب نے جانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ جب تک انہیں مسٹر جناح کی طرف سے تحریری دعوت نامہ موصول نہیں ہوگا وہ لیگ کے سیشن میں شامل نہیں ہوں گے۔ یہ ناممکن تھا، کیونکہ لیگ کے جلسوں میں شمولیت کے لئے لوگوں کو شادی بیاہ کی طرح تحریری دعوت نامے نہیں بھیجے جایا کرتے تھے۔ بایں ہمہ، میں نے کہا کہ میں فوراً دہلی جاتا ہوں اور مودودی صاحب کے لئے تحریری دعوت نامہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن مودودی صاحب نے لیگ سیشن میں شامل ہونے سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ میں لیگ کے انبوہ میں کھو جانے کے لئے تیار نہیں (انہوں نے کہا کہ) میں اپنی پاکیزہ تحریک کو، نام نہاد نسلی مسلمانوں کے ہجوم میں، جن پر لیگ کی ممبر شپ مشتمل ہے، دفن کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتا۔ (میں اس زمانے میں جماعت اسلامی کا سیکرٹری جنرل تھا)۔

اس قسم کے تاسف انگیز تجارب کے باوجود، قائداعظمؒ نے نہ کبھی اپنے مزاج میں تندی یا ترشی کا شائبہ تک آنے دیا اور نہ ہی کسی قسم کا جذبۂ انتقام جوئی پیدا ہونے دیا۔

(بحوالہ۔ ڈان، انگریزی۔ مورخہ ۲۹ اگست ۱۹۷۶ء)

پروفیسر قمرالدین خان کے اس بیان کی روشنی میں قارئین خود فیصلہ فرمالیں کہ میاں طفیل محمد صاحب کا دعویٰ کس حد تک مبنی بر صداقت ہے۔

ایک مدت کے انتظار کے بعد عصرِ حاضر کی نہایت اہم تصنیف

نظامِ ربوبیّت

شائع ہو گئی۔

آپ ایک عرصہ سے سنتے چلے آرہے ہیں کہ اسلام، نہ نظامِ سرمایہ داری کا حامی ہے، نہ کمیونزم کا۔ اس کا اپنا منفرد معاشی نظام ہے۔ جس میں نوعِ انسان کی مشکلات کا حل مضمر ہے۔ لیکن کسی نے یہ نہ بتایا کہ اسلام کا وہ معاشی نظام ہے کیا۔

مفکرِ قرآن پرویز صاحب کی اس تصنیف میں نہایت وضاحت سے بتایا گیا ہے کہ:۔

(۱) نظامِ سرمایہ داری کیا ہے؟ کمیونزم اور سوشلزم کے نظام کیا ہیں۔ اور یہ کیوں ناکام رہ گئے ہیں۔

ان کے برعکس: ——————

(۲) اسلام کا وہ معاشی نظام کیا ہے جو نوعِ انسان کی مشکلات کا اطمینان بخش حل پیش کرتا ہے۔ اس کی روشنی میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ:۔

- مارکس نے کس طرح یہ اعتراف کیا کہ اُس کا نظام ناقابلِ عمل ہے۔
- ماؤزے تنگ کا فلسفۂ اضداد کی بنیادیں کس طرح نااستوار ہیں۔
- ربٰو (سود) کا مسئلہ کیا ہے اور اس کا حل کیا ہے۔
- زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم کیا ہے۔

اس کتاب کے بعد آپ کو معاشیات کے موضوع پر کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں رہے گی۔

کتاب آفسٹ کی چھپائی میں ولایتی سفید کاغذ پر طبع ہوئی ہے۔

ضخامت ساڑھے چار سو صفحات ——— سنہری جلد ——— قیمت فی جلد پچاس روپے /50

محصول ڈاک ——— تین روپے

ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور — ملنے کا پتہ — مکتبۂ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

سید ابوالاعلیٰ مودودی

شرعی سزائیں

تعزیرات کے باب میں سب سے پہلے اس قاعدۂ کلیہ کو ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ ہاتھ کاٹنے کی سزا اور دوسری شرعی حدیں صرف اُسی جگہ نافذ کرنے کے لئے مقرر کی گئی ہیں جہاں مملکت کا نظم و نسق اسلامی اصولوں پر ہو اور تمدن و معاشرت کی ترتیب و تنظیم اس طرز پر کی گئی ہو جو اسلام نے تجویز کیا ہے۔ اسلام کے اصول اور قوانین ناقابل تجزیہ ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ بعض اصول اور قوانین تو نافذ کئے جائیں، اور بعض کو چھوڑ دیا جائے۔

مثلاً زنا اور قذف[1] کی حدود کو لیجئے۔ نکاح و طلاق اور حجاب شرعی کے اسلامی قوانین اور اخلاقِ صنفی کے متعلق اسلام کی تعلیمات سے ان حدود کا نہایت گہرا ربط ہے جسے منقطع نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالےٰ نے زانی اور قاذف کے لئے ایسی سخت سزائیں مقرر ہی اس سوسائٹی کے لئے فرمائی ہیں جس میں عورتیں بن سنور کر بے محابانہ پھرتی ہوں، جس میں برہنہ اور نیم برہنہ تصویریں اور عشق و محبت کے افسانے اور شہوانی جذبات کو دائماً متحرک کرنے والے تماشے رائج نہ ہوں، جس میں نکاح کے لئے پوری آسانیاں ہوں اور فسخ و تفریق اور طلاق و خلع کے اسلامی احکام ٹھیک ٹھیک نافذ کئے جاتے ہوں۔ ایسی سوسائٹی اپنی عین فطرت کے اعتبار سے اس امر کی مقتضی ہوتی ہے کہ اس میں معاشرت کا جو معتدل نظام قائم کیا گیا ہے اس کی حفاظت کے لئے سخت سزائیں مقرر کی جائیں۔ اور اتنی سخت سزائیں اس حالت میں ہرگز غیر منصفانہ نہیں ہیں جبکہ جائز ذرائع سے صنفی خواہشات کی تسکین آسان کر دی گئی ہو اور معاشرت کے ماحول کو بدکاری کی سہولتوں اور غیر معمولی اسبابِ تحریک سے پاک کر دیا گیا ہو۔ ان حالات میں صنفی جرائم کا ارتکاب صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو غایت درجہ کے بدطینت ہوں اور جن کے شر سے خلق اللہ کو محفوظ رکھنے کے لئے نہایت عبرت ناک سزاؤں کے بغیر چارہ نہ ہو۔

لیکن جہاں حالات اس سے مختلف ہوں، جہاں عورتوں اور مردوں کی سوسائٹی مخلوط رکھی گئی ہو، جہاں مدرسوں میں، دفتروں میں، کلبوں اور تفریح گاہوں، خلوت اور جلوت میں ہر جگہ جہاں مردوں اور بنی ٹھنی عورتوں کو آزادانہ ملنے جلنے اور ساتھ اُٹھنے بیٹھنے کا موقع ملتا ہو۔ جہاں ہر طرف بے شمار صنفی محرکات پھیلے ہوئے ہوں اور ازدواجی رشتے کے بغیر خواہشات کی تسکین کے لئے ہر قسم کی سہولتیں بھی موجود ہوں، جہاں معیارِ اخلاق

---

[1] قذف سے مراد کسی عورت یا مرد پر زنا کی تہمت لگانا ہے۔ اور قاذف وہ شخص جو ایسی تہمت لگائے۔

بھی اتنا پست ہو کہ ناجائز تعلقات کو کچھ بہت معیوب نہ سمجھا جاتا ہو، ایسی جگہ زنا اور قذف کی شرعی حد جاری کرنا بلاشبہ ظلم ہوگا۔ اس لئے کہ وہاں ایک غیر معمولی قسم (NORMAL TYPE) کے معتدل مزاج اور سلیم الفطرت آدمی کا بھی زنا سے بچنا مشکل ہے اور ایسے حالات میں کسی شخص کا مبتلائے گناہ ہونا یہ نتیجہ نکالنے کے لئے کافی نہیں ہے کہ وہ غیر معمولی قسم (ABNORMAL TYPE) کا اخلاقی مجرم ہے۔ رجم اور کوڑوں کی سزا در حقیقت ایسے گندے حالات کے لئے اللہ نے مقرر ہی نہیں کی ہے۔

اسی پر حدِ سرقہ کو بھی قیاس کر لیجئے کہ وہ صرف اس سوسائٹی کے لئے مقرر کی گئی ہے جس میں اسلام کے معاشی تصورات اور اصول اور قوانین پوری طرح نافذ ہوں۔ قطعِ ید اور اسلامی نظامِ معیشت میں ایسا رابطہ ہے جس کو منقطع نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں یہ نظامِ معیشت قائم ہو وہاں قطعِ ید ہی عین انصاف اور عین مقتضائے فطرت ہے۔ اور جہاں یہ نظامِ معیشت نہ ہو وہاں چور کا ہاتھ کاٹنا دوہرا ظلم ہے حقیقت میں ہاتھ کاٹنے کی سزا، اس ظالم سوسائٹی کے لئے مقرر ہی نہیں کی گئی ہے جس میں سود جائز ہو، زکوٰۃ متروک ہو، انصاف قیمتاً فروخت کیا جاتا ہو، ٹیکسوں کی بھرمار سے ضروریاتِ زندگی نہایت گراں ہو گئی ہوں، اور تمام ٹیکس چند مخصوص طبقوں کے لئے سامانِ عیش فراہم کرنے پر صرف ہوتے ہوں۔ ایسی جگہ تو چوری کیلئے ہاتھ کاٹنا ہی نہیں بلکہ قید کی سزا بھی بعض حالات میں ظلم ہو گی۔

عام طور پر اسلامی قانونِ فوجداری کو سمجھنے میں لوگوں کو جو دقت پیش آتی ہے اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ وہ اپنے پیشِ نظر تو رکھتے ہیں سوسائٹی کے اس غلط نظام کو جو اس وقت دنیا کے متمدن ممالک میں قائم ہے۔ اور پھر چوری، زنا، قذف اور شراب نوشی جیسے "عامۃ الورود" جرائم کا موازنہ قطعِ ید، رجم اور کوڑوں کی سزاؤں سے کر کے رائے قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس موازنہ میں ان کو اسلام کی سزائیں سخت اور ہولناک ہی نظر آئیں گی کیونکہ نیم شعوری طور پر وہ خود سمجھتے ہیں کہ جو حالات اس نظامِ حیات نے پیدا کر رکھے ہیں ان میں چوری ایک عام چیز ہونی ہی چاہیئے۔ زنا میں بکثرت مردوں اور عورتوں بلکہ بچوں اور بوڑھوں تک کو مبتلا ہونا ہی چاہیئے۔ آئے دن مشتبہ طریقوں سے ملنے والے جوڑوں کے متعلق بُری خبریں مشہور ہونی ہی چاہئیں، بُری صحبتوں میں نوخیز نسلوں کو بُری عادتیں پڑنی ہی چاہئیں۔ لہٰذا ان کا دل یہ سوچ کر پریشان ہو جاتا ہے کہ اگر ان حالات میں اسلامی قانونِ فوجداری رائج کر دیا جائے تو شاید کوئی پیٹھ بھی کوڑوں سے نہ بچ سکے، ہزارہا آدمیوں کے ہاتھ روزانہ کٹنے لگیں اور ہر روز سینکڑوں آدمی سنگسار کئے جائیں۔

بلاشبہ اُن کا یہ خوف بالکل بجا ہے۔ اس بے ہودہ سوسائٹی کے بے ہودہ نظام کو باقی رکھ کر اسلام کے قوانین میں سے محض اصل کے قانونِ فوجداری کو نافذ کر دینا ہمارے نزدیک بھی ویسا ہی ظلم ہوگا جیسا وہ خیال کرتے ہیں۔ مگر جس غلطی کو وہ محسوس نہیں کرتے وہ دراصل یہ ہے کہ انہوں نے سوسائٹی کے اس بے ہودہ نظام کو، جس کی بے ہودگیوں سے وہ مانوس ہو چکے ہیں ایک فطری حالت سمجھ رکھا ہے۔ حالانکہ یہ فطری حالت نہیں ہے، بلکہ شیطنت کے غلبہ نے اس غیر فطری حالت کو عالمِ انسانی پر مسلط کر دیا ہے، اور اس حالت کا باقی

رہنا بجائے خود ایک ظلمِ عظیم ہے۔ آپ اسلام کے نظامِ اجتماعی کو من حیث الکل قبول کر کے اس ظلم کا انسداد کیجئے۔ پھر آپ پر خود روشن ہو جائے گا کہ زنا اور قذف اور چوری اور شراب نوشی انسان کے عام اور فطری مشاغل نہیں ہیں اور انسانوں کی کثیر تعداد کا ان میں مبتلا ہونا متوقع ہی نہیں ہے۔ جو اجتماعی حالات اسلام پیدا کرتا ہے ان میں صرف غیر معمولی قسم کے چند افراد ہی ان افعالِ قبیحہ کا ارتکاب کر سکتے ہیں اور ان کے لئے صحیح تدارک رجم اور کوڑے اور قطعِ ید ہی ہو سکتے ہیں۔

(تفہیمات۔ حصہ دوم۔ ص ۸۳-۲۸۰۔ اگست ۱۹۵۱ء ایڈیشن)

(۰)

(۲) مودودی صاحب اپنے مندرجہ بالا مقالہ کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:-

اس سلسلے میں اپنے دلائل دیتے ہوئے میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی قانونِ فوجداری کی دفعات اس مملکت کے لئے ہیں جس میں پورا اسلامی نظامِ زندگی قائم ہو نہ کہ اس مملکت کے لئے جس میں سارا نظام کفر کے طریقوں پر چل رہا ہو اور صرف ایک چوری یا زنا کی سزا اسلام کے قانون سے لے لی جائے۔ چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا عین انصاف ہے، اگر ملک کا معاشی نظام بھی اس کے ساتھ اسلامی احکام کے مطابق ہو، اور یہ قطعی ظلم ہے، اگر ملک میں اسلام کے منشا کے خلاف سود حلال اور زکوٰۃ متروک ہو اور حاجتمند انسان کی دستگیری کا کوئی انتظام نہ ہو۔ اس ساری گفتگو میں سے اگر کوئی شخص صرف اتنی سی بات نکال لے کہ چوری پر ہاتھ کاٹنے کو یہ شخص ظلم کہتا ہے تو آپ خود ہی سوچئے کہ اس کی سخن فہمی کا ماتم کیا جائے یا دیانت کا۔

(رسائل و مسائل۔ حصہ چہارم۔ ص ۱۹-۱۸۔ اشاعتِ اوّل)

اسی کتاب میں آگے چل کر لکھتے ہیں:-

اس وقت اگر کوئی مسلمان حکومت اسلام کے تمام احکام و قوانین اور اس کی ساری اصلاحی ہدایات کو معطل رکھ کر اس کے قوانین میں سے صرف حدودِ شرعیہ کو الگ نکال لے اور عدالتوں میں ان کو نافذ کرنے کا حکم دے دے، تو جو قاضی یا جج کسی زانی یا سارق یا شاربِ خمر پر حد جاری کرنے کا حکم دے گا وہ تو ظالم نہیں ہوگا، البتہ وہ حکومت ضرور ظالم ہوگی جس نے شریعتِ الٰہیہ کے ایک حصّے کو معطل اور دوسرے حصّے کو نافذ کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں ایسی حکومت کو اس آیتِ قرآنی کا مصداق سمجھتا ہوں جس میں فرمایا گیا ہے: اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ۔ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ (۲:۸۵) "کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کے ساتھ کفر کرتے ہو؟ پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں ان کی سزا اس کے سوا کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار ہو کر رہیں اور روزِ قیامت وہ شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیئے جائیں"..... جہاں تک میں نے شریعت کو سمجھا ہے اس کے نظام میں اصلاح، سدِّ بابِ ذرائع، اور تعزیر کے درمیان ایک مکمل توازن قائم کیا گیا ہے۔ ایک طرف وہ ہر پہلو سے تزکیۂ اخلاق اور تطہیرِ نفوس کی تدابیر ہمیں بتاتی ہے، دوسری طرف وہ ایسی ہدایات ہمیں دیتی ہے جن پر عمل درآمد

کرکے ہم بگاڑ کے اسباب کی روک تھام کر سکتے ہیں، اور تیسری طرف وہ تعزیرات کا ایک قانون ہمیں دیتی ہے تاکہ تمام اصلاحی و انسدادی تدابیر کے باوجود اگر کہیں بگاڑ رونما ہو جائے تو سختی کے ساتھ اس کا تدارک کر دیا جائے۔ شریعت کا منشا اس پوری اسکیم کو متوازن طریقے سے نافذ کرکے ہی پورا کیا جا سکتا ہے۔ اس کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے اس کے کسی جزء کو ساقط اور کسی کو نافذ کرنا حکمتِ دین کے بالکل خلاف ہے۔ اس کے جواز میں یہ استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ جس جزء کو ہم نافذ کر رہے ہیں اس کے نفاذ کا حکم قرآن میں موجود ہے۔ اس استدلال کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک حکیم کا مرتب کردہ نسخہ کسی اناڑی کے ہاتھ آجائے اور وہ اس کے بہت سے اجزاء میں سے صرف دو چار اجزاء نکال کر کسی مریض کو استعمال کرائے اور اعتراض کرنے والے کا منہ بند کرنے کے لئے یہ دلیل پیش کرے کہ جو اجزاء میں استعمال کرا رہا ہوں وہ سب حکیم کے نسخے میں درج ہیں۔ اس کی اس دلیل کا جواب آخر آپ یہی تو دیں گے کہ بندۂ خدا حکیم کے نسخے میں مصلحات اور بدرقے درج تھے ان سب کو چھوڑ کر تو صرف سمیات مریض کو استعمال کرا رہا ہے اور نام حکیم کا لیتا ہے کہ میں اس کے نسخے سے علاج کر رہا ہوں۔ حکیم نے تجھ سے یہ کب کہا تھا کہ تو میرے نسخے میں سے جس جزء کو چاہے چھانٹ کر نکال لے اور جس مریض کو چاہے کھلا دے۔

اس کے ساتھ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ شریعت آیا اپنے نفاذ کے لئے مومن و متقی کارکن چاہتی ہے یا فاسق فاجر لوگ اور وہ لوگ جو اپنے ذہن میں اس کے احکام کی صحت کے معتقد تک نہیں ہیں؟ اس معاملے میں بھی محض جواز اور عدمِ جواز کی قانونی بحث مسئلے کا فیصلہ کرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ مجرد قانونی لحاظ سے ایک امر جائز بھی ہو تو یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ حکمتِ دین کے لحاظ سے وہ درست بھی ہے یا نہیں۔ کیا حکمتِ دین کا یہ تقاضا ہے کہ احکامِ شرعیہ کا اجراء ایسے حکام کے ذریعہ سے کرایا جائے جن کی اکثریت رشوت خور، بدکردار اور خدا و آخرت سے بے خوف ہے۔ اور جن میں ایک بڑی تعداد عقیدتاً مغربی قوانین کو برحق اور اسلامی قوانین کو غلط اور فرسودہ سمجھتی ہے؟ میرے نزدیک تو اسلام کو دنیا بھر میں بدنام کر دینے اور خود مسلم عوام کو بھی اسلام سے مایوس کر دینے کے لئے اس سے زیادہ کارگر نسخہ اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ ان لوگوں کے ہاتھوں احکامِ شریعت جاری کرائے جائیں۔ اگر چند بندگانِ خدا پر بھی جھوٹے مقدمے بنا کر سرقے اور زنا کی حد جاری کر دی گئی تو آپ دیکھیں گے کہ اس ملک میں حدودِ شرعیہ کا نام لینا مشکل ہو جائے گا اور دنیا میں یہ چیز اسلام کی ناکامی کا اشتہار بن جائے گی۔" (رسائل و مسائل - حصہ چہارم - اشاعت اوّل ص ۲۷۰-۲۷۱)

———(٥)———

ب مطالبہ یہ بھی تھا کہ احکامِ شریعت کو فوراً نافذ کیا جائے۔ اس سلسلہ میں مودودی صاحب لکھتے ہیں:-

"اب اگر ہم اسلامی قانون کو از سرِ نو قائم کرنا چاہیں تو یہ تبدیلی بھی یک لخت نہیں، بتدریج ہی ہوگی۔" (ایضاً ص ۲۵۲)

———(٥)———

مودودی صاحب کی ان تصریحات کی روشنی میں، فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مملکتِ پاکستان کے حالات ایسے ہیں کہ یہاں قوانینِ شریعت فوری طور پر نافذ ہو سکیں؟

———(٥)———

حقائق و عبر

۱۔ بتیس سال پہلے کی بات

(طلوعِ اسلام بابت اپریل۔ مئی ۱۹۵۸ء میں ذیل کا شذرہ شائع ہوا تھا)۔

" اس ماہ کی ایک اہم خبر ایران کی ملکہ ثریا کی طلاق ہے۔ یہ خبر اس لئے اہم نہیں کہ طلاق کسی ملک کی ملکہ کو ملی ہے۔ ہمارے نزدیک عورت ہونے کی حیثیت سے دنیا کی ہر عورت یکساں ہے۔ اور ملکہ ہونے کی جہت سے ہر عورت اپنے گھر کی ملکہ ہوتی ہے۔ اس خبر کی اہمیت ان خصوصی حالات کی بنا پر ہے جن کی وجہ سے نوبت طلاق تک پہنچی ہے۔ بتایا یہ گیا ہے کہ شاہ اور ملکہ (میاں اور بیوی) ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کے تعلقات نہ صرف خوشگوار بلکہ محبت و مؤدت کے مظہر تھے۔ ان میں کسی قسم کی کوئی ناچاقی یا بدمزگی نہیں تھی۔ لیکن ان کی سات سالہ ازدواجی زندگی میں ملکہ کے ہاں اولاد نہیں ہوئی اور چونکہ نرینہ اولاد کے بغیر تختِ شہنشاہی بغیر ولی عہد کے رہا جاتا تھا، اس لئے بادشاہ کو بادلِ نخواستہ ملکہ کو طلاق دینی پڑی۔ اور ملکہ کو باصد حسرت و یاس اس فیصلہ کو قبول کرنا پڑا ـــ وہ فیصلہ جس سے ایران کے بہت سے گھرانوں میں صفِ ماتم بچھ گئی۔

اس سے دو اہم سوال ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک عام انسانی حیثیت سے۔ دوسرا قرآنی نقطۂ نگاہ سے۔

عام انسانی حیثیت سے یہ کہ، کیا کسی عورت کے ہاں اولاد نہ ہونا، واقعی ایسا جرم ہے جس سے وہ اس قسم کی انتہائی سزا کی مستحق قرار پا جاتی ہے؟ ہمارا خیال ہے کہ جو لوگ اس سوال کا جواب مثبت میں دیں، انہیں اس کا قطعاً حق حاصل نہیں کہ وہ صفِ انسانیت میں کھڑے ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ (قرآنِ کریم کے تمثیلی انداز میں بیان کردہ قصۂ آدم کی رُو سے)، جب آدم کے دل میں حیاتِ جاوید کی آرزو پیدا ہوئی تو ابلیس نے اس کے کان میں یہ افسوں پھونکا کہ وہ اولاد کے ذریعے حیاتِ جاوید حاصل کر سکتا ہے۔ اسی سے اس کا نام ہمیشہ کے لئے روشن رہ سکتا ہے۔ وہ دن اور آج کا دن، اولاد کی آرزو انسان کی ناک میں نکیل ڈالے نہ معلوم اسے کہاں کہاں لئے پھرتی ہے۔ اور ستم بالائے ستم کہ اس ناکردہ گناہ کی سزا اکثر و بیشتر بیچاری "حوّا کی بیٹی" کو بھگتنی پڑتی ہے۔ خدا جانے آدم کا شعور کب بیدار ہوگا اور وہ کب ابلیس کے اس فریب سے نکل سکے گا کہ وہ حیاتِ جاوید اولاد کے ذریعے حاصل کر سکتا ہے۔ حیاتِ جاوید انسانی ذات کی نشو و نما اور پختگی سے حاصل ہوتی ہے نہ کہ اولاد کے ذریعہ بقائے نسل سے۔ بقائے نسل کا نظریہ ذہنی فریب سے زیادہ کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔

ء شاہنشاہِ ایران کی پہلی بیوی (جسے اس نے چھوڑ دیا تھا) کے ہاں نرینہ اولاد نہیں ہوئی تھی۔

قرآنی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ فیصلہ اور بھی زیادہ تاسف انگیز اور عبرت ناک دکھائی دیتا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ اولاد کا ہونا یا نہ ہونا طبیعی قوانین کے مطابق ہوتا ہے جس پر مرد یا عورت کسی کا بھی اختیار نہیں ہوتا۔ (اگر مرد یا عورت میں سے کسی میں) اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں (اور مناسب علاج کے باوجود یہ صلاحیت پیدا نہیں ہو سکی) تو اس میں فردِ متعلقہ کا کوئی قصور نہیں جس کی وجہ سے اُسے مستحق سزا قرار دیا جائے۔ سورۂ شوریٰ میں ہے، يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ إِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ۔ أَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّإِنَاثًا وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا ..... (۴۲/۴۹) وہ جسے چاہتا ہے (اپنے قانونِ مشیت کے مطابق) بیٹیاں دیتا ہے، جسے چاہتا ہے بیٹے، یا بیٹے اور بیٹیاں دونوں۔ اور جسے چاہتا ہے بے اولاد رکھتا ہے۔ (یہ سب اس کے مقرر کردہ قانونِ طبیعی کے مطابق ہوتا ہے)۔

جہاں تک طلاق کا تعلق ہے قرآن نے کہیں یہ نہیں کہا کہ عورت کا بے اولاد ہونا طلاق (یا نکاح ثانی) کے لئے وجہِ جواز ہو سکتا ہے۔ نکاح کا مقصد میاں بیوی میں سکون اور مؤدت و رحمت ہے (۳۰/۲۱) اور جبتک ازدواجی زندگی میں یہ حسین عناصر موجود ہیں، انقطاعِ تعلقات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اگلی اور سب سے اہم، چیز "ولی عہدی" کا سوال ہے۔ کون مسلمان اس حقیقت سے بے خبر ہے کہ اسلام کی گاڑی اس دن سے دوسری پٹری پر جا پڑی جس دن خلافت، ملوکیت میں تبدیل ہو گئی۔ ملوکیت کے عام معنی ہیں، سلطنت کا باپ سے بیٹے کی طرف وراثتاً منتقل ہونا۔ یہ وہ آواز ہے جو گذشتہ تیرہ سو برس سے ہر محراب و منبر سے اٹھتی اور مسلسل فضا میں پھیلتی رہی ہے کہ سلطنت میں وراثت اور ولی عہدی کا تصور شجرِ اسلام کو جڑ سے کاٹ دیتا ہے۔ لیکن کس قدر بدبختی ہے کہ جہاں تیرہ سو سال سے ہر محراب و منبر سے یہ آواز اٹھ رہی ہے، اس کے ساتھ ہی تیرہ سو برس سے، مسلمانوں کے ہر ملک میں، سلطنت باپ سے بیٹے کی طرف وراثتاً منتقل ہوتی چلی آ رہی ہے۔ حتیٰ کہ آج جبکہ دنیا کی قریب قریب تمام غیر مسلم سلطنتیں زمانے کے تقاضے سے مجبور ہو کر، ملوکیت کو اپنے ہاں سے ختم کر چکی ہیں۔ ملوکیت اگر کہیں باقی ہے تو مسلمانوں کے ممالک میں باقی ہے۔ اور یہی ملوکیت ہے جس نے ایران میں ولی عہدِ سلطنت کی ضرورت کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ اس کے لئے ایک بے گناہ (خانون) کو حوالۂ قربان گاہ کر دیا گیا ہے۔

اس سے بھی آگے بڑھیئے تو ایک چیز بالکل واضح ہے۔ یعنی یہ کہ اس کی ضمانت کیا ہے کہ شاہ ایران کے ہاں کسی اور بیوی سے ضرور بالضرور اولاد پیدا ہو گی۔ اور وہ لڑکا ہی ہو گا۔

اور سب سے آخر یہ کہ، شاہِ ایران (ماشاء اللہ) ابھی جوان ہیں۔ اور قانونِ طبیعی کے مطابق ان کے کافی مدت تک زندہ رہنے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ جس سُرعت سے آجکل مزاجِ روزگار بدل رہا ہے، اس کے پیشِ نظر اس کی بھی کیا گارنٹی ہے کہ جب آج کے ولی عہد کی تخت نشینی کا دور آئے گا، اس وقت اندازِ ملوکیت دنیا میں باقی ہو گا؟"

(طلوعِ اسلام۔ بابت اپریل مئی ۱۹۵۸ء۔ صفحہ ۴۸-۱۴۷)

صحیح کہا تھا کہنے والے نے کہ:

الٹ جائیں گی تدبیریں بدل جائیں گی تقدیریں — حقیقت ہے، نہیں میرے تخیل کی یہ خلاقی (اقبالؒ)

۲۔ جوشؔ وخروش

پچھلے دنوں اخبارات میں شور مچا کہ جوشؔ ملیح آبادی نے اقبالؒ، قائدِاعظمؒ، پاکستان اور اسلام کے خلاف دریدہ دہنی سے کام لیا ہے اس لئے اس کا مواخذہ کرنا چاہیئے۔ اس شور وغوغا سے یوں مترشح ہوا گویا یہ شخص کہیں مریخ سے اس سرزمین پر آٹپکا ہے اور پولیس کی پوچھ گچھ کے دوران اس کے اس قسم کے خیالات معلوم ہوئے ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ نہ یہ شخص مملکتِ پاکستان میں نووارد ہے نہ ہی اس کے یہ خیالات آج کے ہیں۔ یہ، بھارت سے نقل مکانی کے بعد، ایک عرصہ سے یہاں آباد ہے اور شروع ہی سے اس قسم کے خیالات اور عقائد رکھتا ہے جن کے خلاف اب شور مچایا جا رہا ہے۔ طلوعِ اسلام نے آج نہیں۔ آج سے چالیس سال پہلے اس کا تعاقب کیا تھا۔ اس نے ۳۶-۱۹۳۵ء میں دہلی سے ایک ماہنامہ شائع کیا جس کا نام کلیم تھا۔ اس مجلّہ کی اشاعت بابت نومبر ۱۹۳۷ء میں لکھا تھا:۔

نوعِ انسانی کے واسطے کوئی ضابطۂ اخلاق یا نظامِ روحانی مرتب کرنا بچوں کا کھیل نہیں۔ عظیم الشان پیغمبروں کی حسرتناک تاریخیں اور ان کی پاک زندگی کے حوصلہ شکن حالات ہمارے سامنے ہیں اور ہم سے صاف الفاظ میں کہہ رہے ہیں کہ انسان کی دکھتی ہوئی رگ کا چھیڑنا کس قدر بے نتیجہ اور خطرناک ہوا کرتا ہے......... مذہب کا بیان یہ ہے کہ خدا نے انبیاء کے ذریعے سے نوعِ انسانی کی اصلاح کرنی چاہی تھی اور اس سلسلہ میں ہزاروں نہیں لاکھوں انبیاء مبعوث فرمائے گئے تھے۔ مگر نتیجہ کیا ہوا؟ مجھ سے جواب طلب نہ فرمایئے۔ عام انسانی حالات و میلانات کو دیکھ کر خود اندازہ کر لیجئے کہ انسانیت کا سوادِ اعظم اس وقت کس راستے پر گامزن ہے۔ (معاذاللہ)

پھر مارچ ۱۹۳۸ء کی اشاعت میں لکھا:۔

خدا کے تصوّر کی ابتداء انسان کے اس دَور سے شروع ہوئی جبکہ ذہنِ انسانی عالمِ طفولیت میں تھا۔ وہ فطرت کے عظیم الشان مظاہر کی توجیہہ نہ کر سکتا تھا سوائے اس کے کہ ان کو فوق العادت ہستی سے منسوب کر دے......... مذہب کا توہم پرستی کے ساتھ ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ، آج تک بھی جہاں جہاں جہالت زیادہ ہے اور علم کی روشنی کم ہے وہاں مذہب کا دور دورہ ہے مذہب ایک غیبی چیز ہے اور غیبی چیزوں کو تاریکی میں زیادہ فروغ ہوتا ہے۔

یہ تھے مذہب کے متعلق جناب جوشؔ ملیح آبادی کے خیالات۔ جہاں تک مسئلہ قومیت کا تعلق ہے انہوں نے کلیم بابت دسمبر ۱۹۳۷ء میں لکھا تھا:۔

اس کے علاوہ اپنے کو مسلم یا ہندو پہلے اور ہندوستانی بعد کو کہنا جغرافی صداقت اور فطری قانون کے بھی خلاف ہے۔ مذہب زیادہ سے زیادہ ایک ذہنی لباس ہے لیکن قومیت اور وطنیت تو ہمارے بدن کی جلد ہے۔ بدن کی جلد کیسی! قومیت تو ہمارا گوشت پوست اور ہمارا خمیر ہے۔ لباس کو تو ہر وقت بدلا جا سکتا ہے لیکن پوست اور خمیر کو کون بدل سکتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لئے

کہ قومیت اور وطنیت ایک ایسی قدرتی چیز ہے جس کا تبدیل کرنا طاقتِ بشری سے باہر ہے۔
وہ وہاں مسلسل اس قسم کے خیالات کا پرچار کر رہا تھا اور حامیانِ دینِ متین میں سے کسی کی رگِ حمیت میں سرِمو تک پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے کہ وہاں کے علمائے کرام (باستثنائے چند) کانگریس کے ہمنوا تھے اور جوشؔ صاحب بھی کانگریسی تھے۔ اس ہم آہنگیٔ مسلک کی بنا پر ان کے سب "گناہ" قابلِ معافی سمجھے جاتے تھے۔

طلوعِ اسلام کا پہلا پرچہ مئی ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا اور اس نے اپنی دوسری ہی اشاعت (بابت جون ۱۹۳۸ء) میں جوشؔ کی ان لغویات اور شطحیات کا سختی سے مؤاخذہ کیا۔ اور اس کے بعد بھی بر مناسب موقعہ پر ایسا کرتا رہا۔ ملک تقسیم ہو گیا اور ان حضرت نے وہیں رہنا پسند کیا۔ ہم نے بھی کہا کہ اچھا ہوا۔ خس کم جہاں پاک۔

لیکن کچھ عرصہ کے بعد کیا دیکھتے ہیں کہ یہ صاحب پاکستان میں آدھمکے اور جس قومیت کو گوشت، پوست اور خمیر قرار دیتے تھے اسے پرانے کوٹ کی طرح وہیں اتار آئے لیکن اپنے عقائد کے متعلق یہ نہ کہا کہ وہ ان سے تائب ہو گئے ہیں۔ ہم نے اس خطرہ کو محسوس کیا اور طلوعِ اسلام میں بار بار ان کے خلاف لکھتے رہے۔ لیکن یہاں بھی کسی گوشے سے نہ ہماری تائید اور نہ ہی جوشؔ کی مخالفت میں کوئی آواز بلند ہوئی۔ حتیٰ کہ پچھلے دنوں صدرِ مملکت کی قائم کردہ اکادمی اوف لیٹرز کے بانی ارکان کی فہرست میں ان کا نام شائع ہوا، تو بھی اس کے خلاف کہیں سے صدائے احتجاج بلند نہ ہوئی۔ ہم اس سلسلہ میں کچھ لکھنا چاہتے تھے کہ حالیہ شور برپا ہو گیا۔

مذکورہ بالا تصریحات سے واضح ہے کہ جوشؔ صاحب کے خیالات اور عقائد کوئی رازِ پس پردہ نہیں تھا۔ کوئی مستور حقیقت نہیں۔ کوئی پوشیدہ بات نہیں۔ وہ شروع سے ان کا اظہار ہی نہیں، ان کی نشر و اشاعت کرتے چلے آرہے ہیں۔ ماہنامہ کلیمؔ کے مندرجات کے علاوہ، ان کی شاعری پر مشتمل متعدد کتابیں اور پھر ان کی (پاکستان میں شائع کردہ) رسوائے زمانہ آپ بیتی ـــــ یادوں کی بارات ـــــ ان کے اسی قسم کے خیالات کا طومار ہیں۔ ان کے خلاف نہ دانشورانِ قوم میں سے کسی نے کبھی لب کشائی کی۔ نہ مدعیانِ احیائے دین کی رگِ حمیت پھڑکی۔ اب انہیں "اچانک" پتہ چلا کہ ان کے خیالات ایسے ہیں تو دہائی مچا دی گئی۔ جوشؔ کے خلاف جو کاروائی بھی مناسب سمجھی جائے، بجا اور درست۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ حضرات، سب کچھ جانتے بوجھتے، اتنا عرصہ جس طرح منہ میں گھنگھنیاں ڈال کر بیٹھے رہے، کیا یہ بجائے خویش قابلِ سرزنش نہیں؟ اور پھر اس ایک جوشؔ پر ہی کیا موقوف ہے۔ یہاں کتنے اور جوشؔ دندناتے پھر رہے ہیں! ان کا کوئی محاسبہ نہیں؟

جوشؔ کے متعلق یہ انکشاف کیسے ہوا، یہ داستان بڑی دلچسپ ہے اور روزنامہ نوائے وقت مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۹۷۸ء کے اس تمہیدی نوٹ میں مذکور ہے جس کے ساتھ یہ واقعہ منظرِ عام پر لایا گیا ہے وہ نوٹ حسبِ ذیل ہے:

جوشؔ ملیح آبادی۔ یادوں کی بارات میں بالکل ننگا ہے۔ اس ننگے (ننگِ؟) ملت شاعر اور ادیب کا ایک انٹرویو ریڈیو پاکستان نے بظاہر اس مقصد کے لئے ریکارڈ کیا کہ اسے اس کی وفات کے بعد نشر کیا جائیگا۔

انٹرویو کا ٹیپ اور متن "زندگی" کے ہاتھ لگا تو یہ خوفناک حقیقت سامنے آئی کہ جوش نے خالقِ پاکستان حضرت قائداعظمؒ، شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ، پیارے وطن پاکستان اور اسلامی نظریۂ حیات کے بارے میں دریدہ دہنی کا جو مظاہرہ کیا ہے ہم یہ انٹرویو قوم کی عدالت میں پیش کر رہے ہیں تاکہ ان لوگوں کا محاسبہ ہو سکے جو اس شرمناک انٹرویو کو ریکارڈ کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ قوم یہ توقع کرے گی کہ سیکرٹری اطلاعات، وزیرِ اطلاعات اور صدرِ پاکستان اس انٹرویو کی ریکارڈنگ کا سختی سے نوٹس لیں گے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ بعد از مرگ نشر کرنے کا بہانہ بنا کر انٹرویو اس توقع پر ریکارڈ کر کے رکھا گیا ہے کہ (خاکم بدہن) جب بھی اکھنڈ بھارت کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا، تو نئے آقاؤں کی اشیر باد حاصل ہو جائے گی۔

اس نوٹ کے ساتھ وہ انٹرویو، نوائے وقت کی دو اشاعتوں میں شائع ہوا ہے۔

جوش کے متعلق ہمارے خیالات اوپر درج ہیں، جن کی اشاعت ہم گذشتہ چالیس سال سے کرتے چلے آرہے ہیں۔ ہمارے بس میں ہوتا تو ہم اس قسم کے لوگوں کو سرزمینِ پاکستان پر قدم تک نہ دھرنے دیتے۔ لیکن جس انداز سے یہ انٹرویو منظرِ عام پر لایا گیا ہے، اس کے متعلق چند ایک اصولی باتیں وضاحت طلب ہیں۔ یعنی ان کا تعلق جوش کے انٹرویو سے نہیں۔ بنیادی اصولوں سے ہے۔

۱۔ کہا گیا ہے کہ چند سال قبل، (غالباً ۱۹۷۴ء میں) ریڈیو پاکستان نے جوش کا یہ انٹرویو اس وعدہ کے ساتھ ریکارڈ کیا تھا کہ اسے اس کی وفات کے بعد نشر کیا جائے گا۔ سوال یہ ہے کہ اگر ریڈیو نے انٹرویو ریکارڈ کرتے وقت اسے اس امر کی ضمانت دی تھی تو ان کا (اگر قانونی نہیں تو کم از کم) اخلاقی فریضہ تھا کہ وہ اپنے اس معاہدہ پر قائم رہتے۔ حکومت کے اداروں کی طرف سے اس قسم کی پیماں شکنی ——— (BREACH OF TRUST) حکومت کا اعتماد زائل کر دیتی ہے۔ یہ اعتماد ہی تو ہے جس کی بنیادوں پر مملکت کا سارا کاروبار سرانجام پاتا ہے۔ اگر وہ اپنے عہد و پیماں کا احترام نہ کرے تو اس کی بنیادوں میں تزلزل آجائے گا۔

۲۔ کہا گیا ہے کہ اس انٹرویو کا ٹیپ اور متن "زندگی" کے ہاتھ لگا ——— سوال یہ ہے کہ حکومت کے قبضہ اور تحویل میں ٹیپ، مجلہ "زندگی" کے ہاتھ کیسے لگ گیا؟ اس کی تحقیق نہایت ضروری ہے۔ اس لئے کہ اگر حکومت کی تحویل میں دستاویزات یا ریکارڈ ایسے ہی غیر محفوظ ہیں، تو اس کا کوئی راز محفوظ نہیں رہ سکتا۔

۳۔ اور تیسری بات یہ کہ حکومت کی تحویل میں ریکارڈ کو ایک مجلہ نے شائع کس کی اجازت سے کر دیا؟

ہمیں امید ہے کہ حکومتِ پاکستان ان امور کی تحقیق کے بعد، اس کے نتائج کو پبلک کے سامنے لے آئے گی کہ ہمارے نزدیک یہ مسئلہ نہایت اہم ہے۔ واضح رہے کہ ہم نے جو کچھ کہا ہے اس کا تعلق نہ کسی شخصیت (جوش) سے ہے اور نہ کسی خاص صحیفہ (زندگی) سے۔ یہ ایک اصولی سوال ہے اور اصولی طور پر ہی اس کے متعلق گفتگو ہونی چاہیئے۔

(۰)

عائلی قوانین

سابقہ اشاعت میں ہم نے عائلی قوانین کے سلسلہ میں چند اشارات پیش کئے تھے اور کہا تھا کہ اس سلسلہ میں جو بحث ۱۹۶۱-۶۲ء میں چھڑی تھی ہم عندالضرورت اسے دوبارہ شائع کر دیں گے۔ اس ضمن میں ہمیں بہت سے استفسارات موصول ہوئے ہیں جن کے پیشِ نظر ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اس بحث کو اس اشاعت میں شائع کر دیا جائے۔ اس بحث کا پس منظر یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے مروّجہ شخصی قوانین میں (جو صدیوں سے رائج چلے آ رہے ہیں) عورتوں اور یتیموں کے حقوق کی جس قدر پامالی کی گئی ہے اس کے خلاف مسلسل احتجاج سے متاثر ہو کر، صدر محمد ایوب خان (مرحوم) نے ۱۹۶۱ء میں ایک آرڈی ننس کی رُو سے، ان میں کچھ ترمیمات کیں۔ یہ ترمیمات من و عن قرآنِ کریم کے احکام کے مطابق تو نہیں تھیں لیکن مروّجہ قوانین کے مقابلہ میں بہرحال، منشاءِ قرآن سے زیادہ قریب تھیں اور ان سے کسی حد تک عورتوں اور یتیموں کے مظلوم طبقہ کی دادرسی ہو جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ ہماری مذہبی پیشوائیت اسے کسی صورت میں برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ ان کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوئی۔ اس مخالفت کے حق میں ان کی طرف سے دلیل کیا دی جاتی تھی، وہ سننے کے قابل ہے۔

مرکزی جمعیت اہلِ حدیث کے اس زمانے کے صدر اور ممتاز عالم مولانا محمد داؤد غزنوی (جو اب مرحوم ہو چکے ہیں) نے کہیں کہہ دیا کہ یہ (صدر مرحوم کے نافذ کردہ) عائلی قوانین ایسے نہیں کہ تمام کے تمام مسترد کر دیئے جائیں۔ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جنہیں جزئی ترمیمات کے بعد قبول کیا جا سکتا ہے۔ اس پر جماعتِ اسلامی کے ترجمان، ایشیا، نے اپنی ۲۰ اگست ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں ان پر بڑی لے دے کی اور لکھا کہ:-

> مولانا جب یہ استدلال کر رہے ہیں تو ہم حیرت کے ساتھ سوچ رہے ہیں کہ ان کے قلم سے مولانا محمد داؤد غزنوی، امیر مرکزی جمعیت اہلِ حدیث بول رہے ہیں یا منکرینِ سنّت کے سرخیل غلام احمد پرویز۔ حکومت کے سربراہ اور امیرِ مملکت کو ــــ وہ کسے باشد ــــ حضرت عمرؓ کے مقام پر رکھ کر شریعتِ اسلامی کی تعبیر کرنے کا حق دینا، وہ ضال اور مضل نظریہ ہے جس نے عہدِ حاضر میں اسلام کے لئے سب سے بڑا خطرہ پیدا کر دیا ہے اور جس کی آڑ لے کر آج اسلام کا حلیہ، ترکی، مصر، انڈونیشیا، تیونس اور دوسرے ممالک میں بگاڑا جا رہا ہے اور پاکستان میں بھی اس کی بنیاد ڈالی جا رہی ہے۔ اس نظریہ کے حق میں منکرینِ سنت بالکل وہی دلیل دیتے ہیں جو اہلِ حدیث مولانا غزنوی نے پیش فرمائی ہے۔
>
> (بحوالہ طلوعِ اسلام۔ بابت اکتوبر ۱۹۶۳ء)

طلوعِ اسلام بابت اگست ۱۹۶۲ء میں ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس میں ان (عائلی) قوانین کا تجزیہ کیا گیا تھا۔

اس میں انداز یہ اختیار کیا گیا تھا کہ ان معاملات کے متعلق پہلے قرآنی احکام درج کئے گئے تھے اور اس کے بعد عائلی قوانین۔ اور ان دونوں کے تقابل سے یہ واضح کیا گیا تھا کہ قوانین کسی حد تک قرآنی منشا کے مطابق ہیں اور ان میں کہاں کہاں ترمیم و اصلاح کی ضرورت ہے۔ یہ مقالہ درج ذیل ہے۔

(۰)

عائلی قوانین

(قرآنِ کریم کی روشنی میں)

۱۔ نکاح

قرآنِ کریم کی رُو سے، ایک مرد اور عورت کا ان تمام ذمہ داریوں اور حقوق کو لئے ہوئے جو اللہ تعالیٰ نے اس باب میں متعین کئے ہیں، میاں بیوی کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کا معاہدہ "نکاح" کہلاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اسے مِيثَاقًا غَلِيظًا (۴/۲۱)۔ "پختہ عہد" سے تعبیر کیا ہے۔

اس معاہدہ کی شرائط

معاہدہ کوئی بھی ہو، اس کے لئے ضروری ہے فریقین بالغ ہوں اور وہ معاہدہ، ان کی باہمی رضامندی سے بلا کسی قسم کے جبر و اکراہ کے ہو۔ قرآنِ کریم نے معاہدۂ نکاح کے لئے، ان دونوں شرطوں کو ضروری قرار دیا ہے۔ اس نے بلوغت کے لئے "نکاح کی عمر" کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ سورۂ نساء میں ہے:۔

بلوغت

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ (۴/۶)

(تم جب یتیموں کے سرپرست بنو تو) انہیں پرکھتے رہو تاآنکہ وہ "نکاح کی عمر" کو پہنچ جائیں۔ پھر اگر تم ان میں عقل کی پختگی پاؤ تو ان کے مال و متاع ان کے حوالے کر دو۔

یہاں کہا گیا ہے کہ جب یتیم "نکاح کی عمر" کو پہنچ جائیں تو ان کے مال ان کے حوالے کر دو۔ اور سورۂ انعام میں ہے: حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ (۶/۱۵۳)۔ جب وہ "جوانی کی عمر" تک پہنچ جائیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے "نکاح کی عمر" جوانی ہے۔ جب تک لڑکا اور لڑکی جوان نہ ہو جائیں، وہ نکاح

کی عمر کو نہیں پہنچتے۔ لہٰذا، قرآن کی رو سے نابالغ کی شادی نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ نکاح کی عمر کو نہیں پہنچتا۔

یہ جو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ نکاح کے وقت حضرت عائشہ رضؓ کی عمر چھ سال کی تھی، تو یہ بالکل غلط ہے۔ نکاح کے وقت ان کی عمر سترہ اور اکیس برس کے درمیان تھی۔

(ب) نکاح کے لئے باہمی رضامندی ضروری ہے۔ چنانچہ مردوں کے متعلق ہے: فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (۴/۳) "تم ایسی عورتوں سے شادی کرو جو تمہیں پسند ہوں"۔ اور عورتوں کے متعلق کہا کہ: لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا۔ (۴/۱۹)۔ تمہارے لئے قطعاً جائز نہیں کہ تم عورتوں کے زبردستی مالک بن جاؤ۔ ایسا کرنا حلال ہی نہیں"۔

لہٰذا، جس نکاح میں مرد اور عورت دونوں کی رضامندی شامل نہیں، وہ نکاح، قرآن کی رُو سے نکاح ہی نہیں کہلا سکتا۔

چونکہ کم سنی میں نکاح ہو نہیں سکتا، اس لئے نکاح کے لئے ولی (سرپرست) کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بالغ لڑکی کا کوئی ولی نہیں ہوتا۔ وہ اپنے معاملات کی خود مختار ہوتی ہے۔

۲۔ نکاح سے مقصد

(ا) نکاح سے مقصد محض جنسی جذبہ کی تسکین نہیں بلکہ ان تمام ذمہ داریوں کا پورا کرنا ہے جو نکاح سے عائد ہوتی ہیں۔ اگر کوئی شخص محض جنسی جذبہ کی تسکین کے لئے "نکاح" کرتا ہے، اور ان ذمہ داریوں کی پرواہ نہیں کرتا جو نکاح کی رُو سے عائد ہوتی ہیں، تو قرآن کریم کی رُو سے وہ حقیقی معنوں میں نکاح نہیں ہوتا۔ اس لئے، اس کی وضاحت مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ (۴/۲۴) کہہ کر دی ہے۔ "مُحْصِنِيْنَ" کے معنی ہیں، حدود و قیود کے اندر رہنے کے لئے۔ اور مُسَافِحِيْنَ سے مراد ہے محض جنسی جذبہ کی تسکین کے لئے۔

حقوق و فرائض

(ب) نکاح سے، مرد اور عورت دونوں پر یکساں حقوق اور یکساں فرائض عائد ہوتے ہیں۔ سورۂ بقرہ میں ہے وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ[1] (۲/۲۲۸) قاعدے اور قانون کے مطابق، عورت کے حقوق بھی اتنے ہی ہیں جتنی اس کی ذمہ داریاں ہیں۔

(ج) میاں بیوی کے تعلقات ایسے خوشگوار ہونے چاہئیں کہ اس سے گھر میں کامل سکون اور اطمینان پیدا ہو۔ قرآن کریم کی رُو سے "ازواج" (جوڑوں) کا مطلب ہی یہ ہے کہ لِتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا (۳۰/۲۱) ان سے تسکین حاصل ہو، اور باہمی محبت اور رفاقت پیدا ہو۔ وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً (۳۰/۲۱) ایسے گھر کو خدا، جنت سے تعبیر کرتا ہے (۲/۲۲۱) اس کے برعکس، جس میاں بیوی میں ہم آہنگی خیالات نہ ہوں، ان کے گھر کو وہ جہنم کہہ کر پکارتا ہے (۲/۲۲۱)۔

مروّجہ قانون

حالیہ نافذ کردہ عائلی قوانین کی رُو سے، نابالغ لڑکی یا لڑکے کے نکاح کو غیر قانونی قرار دیا گیا ہے اور یہ قرآن کی منشاء کے مطابق ہے۔ علماء حضرات اس کی مخالفت کرتے ہیں۔

---

[1] اس آیت میں جو ہے وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ۔ تو اس کا مفہوم "طلاق اور عدت" کے عنوان میں بیان کیا جائے گا۔

(ج) رجسٹریشن

چونکہ نکاح ایک معاہدہ ہے اس لئے اسے ضبطِ تحریر میں لے آنا، اور سرکاری ریکارڈ میں درج کرا دینا ہی بہتر ہے۔ اس سے مستقبل میں پیدا ہونے والے بہت سے جھگڑے مٹ جاتے ہیں۔ قرآن کریم نے تو باہمی لین دین کے معاملات کو بھی تحریر میں لانے کی سخت تاکید کی ہے (2/282)۔ نکاح کا معاہدہ اس سے بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

حالیہ عائلی قوانین میں، اس معاہدہ کو سرکاری رجسٹر میں درج کرانے کی تاکید کی گئی ہے۔ اور مولوی صاحبان اس کی مخالفت کرتے ہیں۔

۲۔ مہر

چونکہ ازدواجی میزان میں، عورت کا پلڑہ، بمقابلہ مرد کے، جھکتا ہے (یعنی عورت کی قدر و قیمت مرد کے مقابلہ میں زیادہ ہے) اس لئے مرد کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ کچھ تحفہ عورت کو دے۔ اسے مہر کہا جاتا ہے۔ یہ مہر کسی بات کا معاوضہ نہیں ہوتا۔ بلکہ کسی قسم کے معاوضہ کے خیال کے بغیر، بطور تحفہ دیا جاتا ہے۔ اس کے لئے قرآن کریم نے "نِحْلَةً" کا لفظ استعمال کیا ہے (4/4) جس کے معنی ہیں "بلا بدل"۔

(ب) قرآن نے مہر کی کوئی مقدار مقرر نہیں کی۔ جو کچھ بھی باہمی رضامندی سے طے ہو جائے وہ مہر ہے۔ لیکن چونکہ اس کا ادا کرنا ضروری ہے، اس لئے اسے علیٰ قدرِ وسعت ہونا چاہیئے۔ (دیکھئے 2/236 ؛ 4/20)۔

(ج) مہر، عورت کی ملکیت ہوتا ہے اور کسی کو حق نہیں کہ اُسے اس سے محروم کر دے۔ البتہ عورت اپنی رضامندی سے اس میں سے کچھ چھوڑ بھی سکتی ہے (4/4)۔

(د) اگر کسی وجہ سے مہر مقرر نہ کیا گیا ہو تو اُسے مرد کی وسعت کے مطابق طے کر لینا چاہیئے (2/236)۔

مروّجہ قانون

حالیہ عائلی قوانین میں کہا گیا ہے کہ اگر شادی کے معاہدہ میں مہر کی ادائیگی کے طریق کار کے متعلق کوئی تفصیل موجود نہ ہو تو مہر کی کل رقم کے متعلق یہ تصوّر کیا جائے گا کہ وہ عند الطلب واجب الادا ہے۔ قرآن کریم میں مؤجل اور معجّل کی کوئی تفریق نہیں۔

۳۔ طلاق

طلاق کے معنی ہیں "نکاح کے معاہدہ سے آزاد ہو جانا"۔ چونکہ یہ معاہدہ فریقین (مرد اور عورت) نے باہمی رضامندی سے استوار کیا تھا اس لئے ان میں سے کسی ایک کو اس کا حق نہیں پہنچ سکتا کہ جب جی چاہے، اپنی مرضی سے اس معاہدہ کو منسوخ کر دے۔ اس میں دوسرے فریق کے حقوق کا تحفظ ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اسے انفرادی فیصلہ پر نہیں چھوڑا ایک معاشرہ کو حکم دیا ہے کہ وہ اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے۔ (معاشرہ سے مراد وہ نظام ہے جو متنازعہ فیہ معاملات میں فیصلہ کرنے کے لئے اسلامی مملکت کی طرف سے قائم ہو۔ اسے عدالت کہا جائے گا)۔ چنانچہ اس باب میں، سورۃ النساء میں ہے:۔

اگر تم کسی میاں بیوی میں، باہمی اختلاف۔ جھگڑے یا مخالفت (شقاق) کا خدشہ محسوس کرو، تو ایک ثالثی بورڈ بٹھاؤ، جس میں ایک ممبر مرد کے خاندان کا اور ایک عورت کے خاندان کا ہو۔ اس بورڈ کی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ وہ ان دونوں میں مصالحت کرائے۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تو امید کی جا سکتی ہے کہ میاں بیوی

میں موافقت کی صورت پیدا ہو جائے گی۔ (4/35)

(۲) اگر ثالثوں کی کوشش سے ان میں موافقت کی صورت نکل آئے تو ہوا المراد۔ لیکن اگر وہ اپنی کوشش میں ناکام رہیں تو ظاہر ہے کہ انہیں اس معاملہ کی رپورٹ اس عدالت کے پاس بھیجنی ہوگی جس نے انہیں ثالث مقرر کیا تھا۔ وہ عدالت فیصلہ کرے گی کہ فریقین میں طلاق ہو جانی چاہیئے۔ اور اس کی شرائط کیا ہوں گی۔ عدالت کے اس فیصلہ کا نام طلاق ہوگا۔

طلاق کے بارے میں حالیہ عائلی قوانین میں دو ایک بنیادی نقص ہیں جن کا دور کیا جانا ضروری ہے۔

(ا) اس میں کہا گیا ہے کہ جو شخص اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہے وہ طلاق کا اعلان کرنے کے فوری بعد، اس امر کی اطلاع (نوٹس) یونین کے چیئرمین کو دے۔

(ii) چیئرمین، ایک ثالثی کونسل مقرر کرے گا تاکہ فریقین میں مصالحت کرائی جائے۔

اگر مصالحت نہ ہو سکے تو، نوٹس کی تاریخ سے نوّے دن کے بعد، طلاق مؤثر ہو جائے گی۔

یعنی معاہدہ نکاح منسوخ تصوّر ہوگا۔

شق (i) میں نقص یہ ہے کہ:-

(ا) اس میں مرد کو حق دیا گیا ہے کہ وہ جب جی چاہے، طلاق کا اعلان کر دے۔ یہ خلافِ قرآن ہے۔ اس شق کو یوں تبدیل کر دینا چاہیئے کہ:-

جو شخص اپنی بیوی کو طلاق دینے کا ارادہ کرے، اسے چاہیئے کہ اپنے اس ارادہ کی اطلاع چیئرمین کو دے۔

اس صورت میں مصالحت کے کچھ معنی بھی ہوں گے۔ ورنہ، طلاق کا اعلان کر دینے کے بعد، ثالثی بورڈ کا تقرر اور مصالحت کی کوشش، بے معنی چیز ہے۔

(ب) دوسرا بنیادی نقص یہ ہے کہ اس میں طلاق کے اعلان کا حق مرد کو دیا گیا ہے۔ عورت کو نہیں۔ عورت کے متعلق کہا گیا ہے کہ:-

اگر طلاق کا حق باضابطہ طور پر بیوی کو دیا گیا ہو تو (وہ طلاق کا اعلان کر کے ثالثی کونسل کی طرف رجوع کر سکتی ہے)۔

"بیوی کو طلاق کا حق باضابطہ طور پر دینے" کا مطلب کچھ نہیں۔ معاہدۂ نکاح کی رُو سے، میاں اور بیوی دونوں کو یکساں حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ اس لئے جن حالات میں، مرد، طلاق حاصل کرنے کا حق رکھتا ہے، انہی حالات میں عورت بھی ویسا ہی حق رکھتی ہے۔ یہ بات تو بڑی تعجب انگیز سی ہوگی کہ معاہدہ تو فریقین کی رضامندی سے ہو اور اس کے فسخ کرنے یا کرانے کا حق صرف ایک فریق کو حاصل ہو۔ دوسرے کو حاصل نہ ہو!

مروجہ قانون کی رُو سے، اگر بیوی کو، "باضابطہ طلاق کا حق" نہ دیا گیا ہو، تو اسے تنسیخ نکاح کے لئے عدالت میں مقدمہ دائر کرنا پڑتا ہے۔ میاں اور بیوی کے لیئے، الگ الگ قوانین، قرآن کے منشاء کے خلاف ہے۔

لہٰذا اس شق کا اطلاق میاں اور بیوی دونوں پر یکساں ہونا چاہیئے۔ یہ ترمیم نہایت ضروری ہے۔ اس کے بغیر مرد کو یہ حق ہر وقت رہتا ہے کہ وہ جب جی چاہے طلاق کا اعلان کر دے۔ اس کے بعد ثالثی کونسل میں جا کر کہہ دے کہ میں مصالحت کرنے پر تیار نہیں۔ ثالثی کونسل اس میں کچھ نہیں کر سکے گی۔ مرد طلاق دے چکا۔ وہ طلاق مؤثر ہو گی۔ یہ وہی ظلم ہے جو مردوں کے ہاتھوں عورتوں پر ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اس قانون نے اس ظلم میں کسی قسم کی کمی یا اصلاح نہیں کی۔ لہٰذا، اس شق کی صورت یوں ہونی چاہیئے کہ:-

میاں یا بیوی میں سے جو کوئی، معاہدۂ نکاح کو فسخ کرنے کا ارادہ کرے، اسے چاہیئے کہ اس امر کی اطلاع چیئرمین کو دے.......

شق (۶)

میں کہا گیا ہے کہ اگر مصالحت نہ ہو سکے تو نوٹس کی تاریخ کے نوّے دن بعد، طلاق مؤثر سمجھی جائے گی۔ (نوّے دن بطور عدّت رکھے گئے ہیں)۔

قرآن کی رُو سے

(ا) طلاق اس دن ہو گی جب عدالت فیصلہ کرے کہ فریقین کا معاہدۂ نکاح فسخ کیا جاتا ہے۔ عدّت بھی اُسی وقت سے شروع ہو گی۔

(ب) عدّت کی مدّت، مختلف حالات میں مختلف ہے۔ قرآنِ کریم میں یہ تفصیلی طور پر مذکور ہے۔ وہی مدّت ہمارے قانون میں درج ہونی چاہیئے۔ موجودہ شق ناقص ہے۔

نوٹ:- ان تمام معاملات میں، عائلی قوانین کی رُو سے، یونین کونسل اور اس کے چیئرمین کو مجاز قرار دیا گیا ہے، ہماری رائے میں اس کی جگہ کسی باقاعدہ عدالت کو یہ اختیارات حاصل ہونے چاہئیں۔ [۱]

مولوی صاحبان کی طرف سے طلاق کے متعلق اس پوری کی پوری شق کی سخت مخالفت ہوئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:-

(۱) مرد کو حق حاصل ہے کہ جب چاہے۔ طلاق، طلاق، طلاق کہہ کر بیوی کو گھر سے نکال دے۔ عورت کو ایسا حق حاصل نہیں۔

(۲) اگر عورت گلو خلاصی کرانا چاہے تو اسے عدالت کی طرف رجوع کرنا ہو گا اور اسے ثابت کرنا ہو گا کہ وہ واقعی علیحدگی کی مستحق ہے۔ اسے طلاق نہیں بلکہ خلع کہا جاتا ہے جس کے لئے عورت کو حقِ مہر چھوڑنا پڑتا ہے۔

(۳) یہ بات مرد کے اختیار میں ہے کہ وہ عورت کو طلاق کا حق تفویض کرے یا نہ کرے۔

۴۔ طلاق کے بعد

عدالت کے فیصلہ سے نکاح منسوخ ہو گیا۔ اس کے بعد، عدّت کے دوران، یہ عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح نہیں کر سکتی۔ لیکن اگر یہ (سابقہ) میاں بیوی چاہیں تو آپس میں شادی کر سکتے ہیں۔

---

[۱] اب اس کے لئے فیملی کورٹ کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ (سنہ ۱۹۷۶ء)

(ب) جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، عدّت کے دوران یہ عورت کسی دوسرے مرد سے شادی نہیں کر سکتی۔ لیکن مرد پر اس کی کوئی پابندی نہیں۔ وہ جب چاہے، کسی دوسری عورت سے شادی کر سکتا ہے (بس یہ ایک "زائد حق" ہے جو عورت کے مقابلہ میں مرد کو حاصل ہے۔ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (۲/۲۲۸) میں اسی زائد حق کی طرف اشارہ ہے۔

(ج) اگر یہ سابقہ میاں بیوی چاہیں تو عدّت کی مدّت کے بعد بھی آپس میں شادی کر سکتے ہیں۔ اگر انہوں نے (عدّت کے دوران یا اس کے بعد) آپس میں شادی کر لی لیکن اس کے بعد پھر، مذکورہ بالا طریقہ کے مطابق، ان میں طلاق ہو گئی، تو دوسری مرتبہ بھی یہ میاں بیوی، عدّت کے دوران یا عدّت کے بعد، آپس میں شادی کر سکتے ہیں۔ (یہ دوسری مرتبہ کی طلاق کے بعد کی' شادی ہوگی)۔

لیکن اگر ان میں پھر طلاق کی نوبت آ جائے (یعنی تیسری مرتبہ طلاق ہو جائے) تو پھر یہ میاں بیوی آپس میں شادی نہیں کر سکتے، نہ عدّت کے دوران، نہ اس کے بعد۔ قرآن میں ہے۔ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ (۲/۲۲۹) "طلاق دو مرتبہ کی ایسی ہے جس کے بعد تم، قاعدہ کے مطابق، عورت کو (نکاح میں) روک سکتے ہو یا حسن کارانہ انداز سے رخصت کر سکتے ہو"۔ لیکن تیسری مرتبہ کی طلاق کے بعد تم آپس میں نکاح نہیں کر سکتے، یہ مطلب ہے "تین طلاق" سے۔

عائلی قانون

میں یہ شق قرآن کریم کی منشاء کے مطابق ہے۔ البتہ اس میں ذیل کے اضافے کی ضرورت ہے۔ یعنی

(د) اگر اس عورت کو نئے خاوند سے طلاق مل جائے۔ یا وہ فوت ہو جائے، تو پھر یہ عورت، اگر چاہے تو اپنے سابقہ خاوند سے شادی کر سکتی ہے۔ (۲/۲۳۰)۔

مولوی صاحبان اس شق کے بھی سخت خلاف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مرد کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ جب چاہے، تین دفعہ (طلاق۔ طلاق۔ طلاق) کہہ دے۔ اس کے بعد وہ عورت اس پر حرام ہو جائے گی۔ اس کے پھر سے حلال ہونے کی ایک ہی شکل ہے کہ عورت (خواہ ایک رات کے لئے) کسی دوسرے آدمی سے نکاح کرے۔ اس کے ساتھ شب بسری کرے۔ دوسری صبح وہ مرد اسے طلاق دے دے۔ اس کے بعد یہ اپنے سابقہ خاوند سے نکاح کر سکتی ہے۔ اس طریق کو حلالہ کہتے ہیں۔

(۰)

۵۔ تعدّدِ ازدواج (ایک سے زیادہ بیویوں سے نکاح)

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم کی رُو سے، نکاح سے مقصد یہ ہے کہ انسان امن و سکون کی زندگی بسر کر سکے۔ میاں بیوی میں باہمی محبّت اور رفاقت کا تعلق ہو جس سے گھر "جنّت" بن جائے۔ اس مقصد کے پیش نظر اس نے تاکید کی ہے کہ بیوی (یا میاں) کے انتخاب میں، خیالات اور نظریات کی موافقت کا خیال رکھا جائے۔ نکاح، فریقین کی رضامندی سے، بغیر کسی قسم کے جبر و اکراہ کے ہو۔ اس قدر احتیاط کے باوجود، اگر تجربہ بتائے کہ انتخاب صحیح نہیں تھا اور اس رشتے کا نباہ مشکل ہے، تو نکاح کا معاہدہ فسخ کر لیا جائے، اور کسی دوسری عورت (یا مرد) سے

شادی کرلی جائے۔ سورۂ نساء میں ہے: وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ..... (4/20)
"اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی سے نکاح کرنا چاہو (تو اس طریق کے مطابق جس کا ذکر طلاق کے عنوان میں کیا جا چکا ہے)۔ پہلی بیوی سے معاہدۂ نکاح فسخ کرلو، اور پھر دوسری عورت سے شادی کرو۔ اِس سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، شادی کا اصول "ایک وقت میں ایک بیوی" (MONOGAMY) ہے۔

ہنگامی حالات

(۲) لیکن قرآن کریم اسے بھی تسلیم کرتا ہے کہ بعض اوقات ایسے ہنگامی حالات پیدا ہو سکتے ہیں جن کے پیشِ نظر، اس اصولی قانون میں، استثناء کی ضرورت لاحق ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے حالات اسلام کے ابتدائی دور میں، مدینہ کی زندگی میں پیدا ہو گئے تھے۔ اس وقت کیفیت یہ تھی کہ:-

(۱) مسلمانوں کی ایک محدود سی جماعت تھی (جنگِ بدر میں، جو سنہ ۲ ھ میں ہوئی تھی مسلمان مجاہدین کی تعداد صرف ۳۱۳ تھی)۔

(۲) مسلسل لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو رسول اللہ کی پوری مدنی زندگی میں جاری رہا۔

(۳) ان لڑائیوں کی وجہ سے، اس مختصر سی جماعت میں، نوجوان افراد کی کمی ہوتی چلی گئی اور بیوائیں اور یتیم بچے دن بدن زیادہ ہوتے گئے ان کے علاوہ مسلمان عورتیں، مکہ میں اپنے غیر مسلم خاوندوں کو چھوڑ کر، مدینہ کی طرف آنا شروع ہو گئیں۔

(۴) مسلمان عورتیں، صرف مسلمان مردوں سے شادی کر سکتی تھیں۔ کسی غیر مسلم سے نہیں کر سکتی تھیں۔ حتیٰ کہ اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) سے بھی نہیں۔

(۵) لہٰذا، اُس وقت صورت یہ پیدا ہو گئی کہ بیواؤں کی۔ اور شادی کے قابل لڑکیوں کی تعداد، مردوں کے مقابلہ بہت زیادہ ہو گئی۔ بیواؤں کے ساتھ ان کے چھوٹے چھوٹے بچے یتیم اور لاوارث رہ گئے۔

(۶) ان ہنگامی حالات میں، اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ "ایک بیوی" کے اصولی قانون میں استثناء (EXCEPTION) کر دی جائے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر، قرآن نے کہا کہ:-

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً ..... (4/3)

اس آیت کے تین حصے ہیں اور تینوں کا ترجمہ اور مفہوم حسبِ ذیل ہے۔

(۱) وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى ....

اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم یتامیٰ کے ساتھ انصاف نہیں کر سکو گے ...... تو

عربی زبان میں "یتٰمیٰ" یتیم بچوں کو بھی کہتے ہیں اور ان عورتوں کو بھی جن کے شوہر نہ ہوں۔ (خود قرآنِ کریم میں یَتٰمَی النِّسَآءِ انہی معنوں میں آیا ہے۔ 4/127) لہٰذا آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں جس میں تم دیکھو کہ معاشرہ میں یتیم بچے اور بے شوہر کی عورتیں زیادہ ہو گئی ہیں، اور "ایک مرد۔ ایک عورت" کے اصول کے مطابق ان کے مسئلہ کا منصفانہ حل نہیں مل سکتا تو کیا کرو؟

(۲) فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ

ان میں سے جو عورتیں تمہیں پسند ہوں، ان سے نکاح کر لو۔ دو، دو۔ تین، تین۔ چار، چار تک یعنی ایسی صورت میں "ایک بیوی" کے اصول میں استثناء کر لو اور ان بے شوہر عورتوں کو اپنے خاندان کا جزو بنا لو۔ جتنی ان کی تعداد ہو اُس لحاظ سے۔ مقصد یہ ہے کہ یہ لاوارث عورتیں اور ان کے بچے، مختلف خاندانوں میں جذب ہو جائیں۔

(۳) فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً۔

لیکن اگر تمہیں خدشہ ہو کہ تم عدل نہیں کر سکو گے، تو پھر وہی "ایک بیوی" کا اصول برقرار رہے گا۔

بات بالکل صاف ہے۔ "عدل" کے متعلق قرآنِ کریم نے آگے چل کر کہہ دیا کہ جہاں تک جذبات کا تعلق ہے، ان میں یکسانیت کا سلوک تو ناممکن ہے۔ اتنی احتیاط رکھو کہ کسی ایک کی طرف اتنا نہ جھک جاؤ کہ دوسری ادھر لٹکی رہ جائے (۴/۱۲۹) —— کہاں وہ بیوی جو تمہاری عمر بھر کی رفیقہ ہے۔ جس کی وجہ سے گھر جنت کا نمونہ بن رہا ہے۔ اور کہاں یہ، جسے تم محض معاشرہ کی ایک اجتماعی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے جزوِ خاندان بنا رہے ہو۔ تمہارے جذبات دونوں کے ساتھ یکساں نہیں ہو سکتے۔ لیکن اس سے یہ نہ ہو کہ یہ نو آمدہ —— جو بیچاری پہلے ہی مصیبت زدہ۔ بیکس اور لاوارث ہے —— نہ اِدھر کی رہے نہ اُدھر کی۔

پہلی بیوی کی رضامندی

یہ بھی ظاہر ہے کہ دوسری بیوی لانے کے لئے، پہلی بیوی کی رضامندی ضروری ہے۔ اس لئے کہ:۔

(i) قرآنِ کریم نے ازدواجی زندگی کا مقصد یہ بتایا ہے کہ میاں بیوی میں باہمی محبت اور رفاقت کے تعلقات ہوں اور گھر میں سکون و اطمینان رہے۔ ظاہر ہے کہ اگر دوسری شادی، پہلی بیوی کی مخالفت کے باوجود کی جائے، تو پہلی بیوی کے ساتھ محبت اور موانست کیسے رہ سکتی، اور گھر میں سکون و اطمینان کہاں باقی رہے گا؟ ایسا ہونا ناممکن ہے! اس لئے پہلی بیوی کی عدم رضامندی سے دوسری بیوی لائی ہی نہیں جا سکتی۔ قرآن کا یہ منشاء نہیں کہ کسی اُجڑے ہوئے کنبہ کو آباد کرنے کے لئے، اپنے بستے رستے گھر کو ویران کر دیا جائے۔

(ii) قرآنِ کریم نے دوسری شادی کے لئے عدل کی شرط عائد کی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب پہلی بیوی، دوسری شادی کی مخالفت کر رہی ہو، اور اس کی مخالفت کے علی الرغم دوسری بیوی گھر میں آ جائے، تو پہلی بیوی سے عدل کس طرح ہو سکے گا؟

(iii) قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ اگر میاں بیوی میں ناچاقی ہو جائے تو ایک ثالثی بورڈ قائم کرو تاکہ ان دونوں میں مصالحت کرا دی جائے۔ اگر ان میں مصالحت نہ ہو سکے تو پھر نکاح فسخ کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ جب دوسری شادی، پہلی بیوی کی مخالفت کے باوجود کی جائے گی، تو (پہلے) میاں بیوی میں ناچاقی اُسی وقت شروع ہو جائے گی، اور اس ناچاقی کی وجہ وہ ہو گی (یعنی دوسری بیوی) جس کی موجودگی میں مصالحت کی کوئی صورت ہی نہیں ہو سکے گی۔ اس کی صورت یہی ہو گی کہ یا پہلی بیوی کو (ناحق) طلاق دے دی جائے، یا دوسری بیوی کو چھوڑ دیا جائے۔

یہ چیز کہ دوسری شادی کے لئے، پہلی بیوی کی رضامندی ضروری ہے، خود نبی اکرم ﷺ کے ایک ذاتی فیصلہ سے

بھی ثابت ہے۔

ایک دفعہ حضرت علی رضؓ نے دوسرا نکاح کرنا چاہا۔ آنحضرت (صلعم) کو معلوم ہوا تو سخت برہم ہوئے۔ آپؐ نے مسجد میں خطبہ دیا۔ اس میں اپنی ناراضی کی۔ فرمایا۔ "میری لڑکی میرا جگر گوشہ ہے۔ جس سے اُسے دکھ پہنچے گا، مجھے اذیت ہو گی۔" چنانچہ حضرت علی رضؓ اس ارادے سے باز آ گئے، اور حضرت فاطمہ رضؓ کی زندگی تک دوسرا نکاح نہ کیا۔

(سیرۃ النبیؐ علامہ شبلیؒ۔ جلد دوم صفحہ ۶۲۷۔ بحوالہ بخاری)

ظاہر ہے کہ رسول اللہؐ نے جو کچھ اپنی بیٹی کے متعلق فرمایا ہے اس کا اطلاق اُمت کی ہر بیٹی پر ہو گا۔ اس لئے جس دوسرے نکاح سے پہلی بیوی کو دکھ پہنچے، وہ رسول اللہؐ کے اس فیصلہ کے مطابق بھی جائز نہیں قرار پا سکتا۔ کہا جائیگا کہ پہلی بیوی، دوسری شادی کی اجازت کیسے دے گی! سو پہلی بات تو یہ ہے کہ جن حالات کے پیشِ نظر قرآن نے دوسری شادی کی اجازت دی ہے، ان میں مومن عورتیں، اپنے خانماں برباد، لاوارث، بے کس بہنوں کی امداد کے لیئے یقیناً آگے بڑھ آئی ہونگی (اور انہی جیسے حالات میں، مومن عورتوں سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ آگے بڑھیں گی)۔ علاوہ ازیں دوسری بیوی بھی، پہلی بیوی کے سر پر سوار ہونے کا جذبہ لے کر نہیں آئے گی۔ وہ اس کی ممنونِ احسان ہو گی۔

لیکن اس کے باوجود، اگر پہلی بیوی کسی وجہ سے، دوسری شادی کے حق میں نہیں، تو دوسری شادی کی اجازت نہیں ہو سکتی۔

بے شوہر کی عورتوں کا منصفانہ حل اسی صورت میں مل سکتا ہے جب وہ اس طرح جزوِ خاندان بنائی جائیں کہ گھروں کا امن و سکون قائم رہے اور پہلے میاں بیوی میں محبت اور رفاقت کا تعلق بدستور باقی رہے۔ اگر اس سے گھر جہنم بن جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم نے ایک مشکل کا حل تلاش کرتے کرتے دس مشکلات اور پیدا کر لیں۔

———— (٠) ————

دوسری شادی کے لئے، قرآنِ کریم میں صرف یہی ایک آیت ہے جسے اوپر درج کیا جا چکا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ دوسری شادی کے لیئے تین شرطیں ضروری ہیں۔

اوّل۔ بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کے مسئلہ کی موجودگی۔

دوم۔ پہلی بیوی کی رضامندی۔ اور

سوم۔ عدل۔

حضورؐ کا اسوۂ حسنہ

اگر ان میں سے کوئی ایک شرط بھی موجود نہیں تو قرآن کی رُو سے دوسری شادی کی اجازت نہیں۔ نہ ہی مقصدِ اوّل کے علاوہ کسی اور مقصد کے لیئے دوسری شادی کی اجازت ہے۔

خود نبی اکرمؐ کا اسوۂ حسنہ بھی اس پر دلالت کرتا ہے۔

(۱) حضورؐ نے پچیس سال کی عمر تک شادی نہیں کی اور ساری جوانی سپیدۂ سحر کی طرح بے داغ رہی۔

(۲) پچیس سال کی عمر میں ایک صاحبِ اولاد، بیوہ سے شادی کی جن کی عمر اُس وقت چالیس سال کی تھی۔

(۳) جب تک وہ بیوی (حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضؓ) زندہ رہیں، حضورؐ نے دوسری شادی نہیں کی، حالانکہ ان کی عمر وفات کے وقت قریب پینسٹھ سال بھی زیادہ تھی۔ یعنی بیوی کی اس قدر عمر رسیدگی کے باوجود، دوسری شادی کا خیال تک نہیں کیا۔ واضح رہے کہ اس وقت حضورؐ کی نرینہ اولاد بھی کوئی نہیں تھی ـــ جو لڑکے پیدا ہوئے تھے وہ وفات پا چکے تھے)۔

(۴) حضرت خدیجہ رضؓ کی وفات کے بعد صرف ایک شادی ہے جو حضورؐ نے غیر شادی شدہ عورت (حضرت عائشہ رضؓ) سے کی۔ (اور وہ اس وقت جب ہنوز جنگوں کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا)۔ باقی تمام نکاح، ان ہنگامی حالات میں ہوئے جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، اور ان عورتوں سے جو (کئی کئی بار کی) بیوہ یا مطلقہ تھیں اور لاوارث و بے کس، یا بالعموم عمر رسیدہ۔ مقصد اس سے ان محتاجوں اور بے کسوں کی پناہ دہی تھی۔ چنانچہ باسورتھ سمتھ (BOSWORTH SMITH) اس باب میں لکھتا ہے کہ:۔

> محمدؐ کی شادیوں کی توجیہہ جس طرح دیگر مقاصد کے تحت کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح اس مقصد کے تحت بھی کہ اس سے کس مپرس، بے نوا افراد کے حالات پر ترس کھانا مقصود تھا۔ یہ شادیاں ان عورتوں سے ہوئیں جو قریب قریب سب کی سب بیوہ تھیں اور نہ اپنے حسن و جمال اور نہ مال و دولت کی بنا پر کوئی شہرت رکھتی تھیں۔ بلکہ صورتِ حالات اس کے بالکل برعکس تھی۔
>
> (MOHAMMAD AND MOHAMMADANISM)

باقی رہا یہ کہ ان شادیوں میں، پہلی ازواجِ مطہرات رضؓ کی رضامندی شامل ہوتی تھی۔ سو اس کا ثبوت یہ ہے کہ روایات کی رو سے یہ (پہلی بیویاں) ہر نئی آنے والی بیوی کا خیر مقدم کرتی تھیں اور اسے مبارک باد دیتی تھیں۔ اگر یہ شادیاں ان کی مرضی کے خلاف ہوتیں تو وہ آنے والی کے استقبال اور مبارکباد کے لئے کبھی آگے نہ بڑھتیں۔ ضؔ

(۰)

حالیہ عائلی قوانین

حالیہ عائلی قوانین میں اگرچہ یہ کہا گیا ہے کہ ثالثی کونسل کی منظوری کے بغیر دوسری شادی نہیں کی جا سکتی لیکن اس کے لئے صرف پہلی بیوی کی رضامندی کو شرط قرار دیا گیا ہے۔ قرآنی شرط کا کوئی ذکر نہیں۔

لیکن ہمارے علماء حضرات پر اتنی سی شرط بھی سخت گراں گذر رہی ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ مرد کو بلا مشروط حق حاصل ہے کہ جب جاہے چار تک بیویاں کر لے۔ اس کے اس حق پر کسی قسم کی پابندی عائد کرنا! "شریعت" کے خلاف ہے۔ چار بیویوں کے علاوہ، وہ لونڈیاں رکھنے کا حق بھی برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔

۲۔ وراثت

حالیہ عائلی قوانین میں ایک شق یہ بھی ہے کہ:۔

ضؔ ہم نے اس جگہ، اور دیگر مقامات پر حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے ان روایات کو ہم اس لئے صحیح مانتے ہیں کہ وہ قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق ہیں۔ یہی، روایات کے صحیح یا غلط ہونے کا بنیادی معیار ہے۔

اگر وراثت کے شروع ہونے سے پہلے، مورث کے کسی لڑکے یا لڑکی کی موت واقع ہو جائے تو ایسے لڑکے یا لڑکی کے بچوں کو (اگر کوئی ہوں) بحصّہ رسدی وہی ملے گا جو اس لڑکے یا لڑکی کو (جیسی کہ صورت ہو) زندہ ہونے کی صورت میں ملتا۔

یہ بات حسبِ ذیل نقشہ سے سمجھ میں آسکے گی۔

اگر زید کی زندگی میں بکر فوت ہو جائے تو رشید یتیم رہ جائے گا۔ اس کے بعد جب زید کی وفات ہوگی تو، حضرات علمائے کرام کے ارشاد کے مطابق، زید کی جائداد میں سے رشید (یتیم پوتے) کو کچھ نہیں ملے گا۔ ساری جائداد عمر کو مل جائے گی۔ رشید اپنے دادا کی جائداد سے اس لئے محروم کر دیا گیا کہ وہ بچارا یتیم رہ گیا تھا!

عائلی قوانین میں کہا گیا ہے کہ (یہ اس یتیم کے ساتھ بڑی بے انصافی ہے)۔ زید کی وفات پر، رشید کو وہی حصّہ ملنا چاہیئے جو اس کے باپ کو ملتا۔ یہ قانون قرآنِ کریم کی تعلیم کے مطابق ہے۔ اس سلسلہ میں ہم تفصیل کے ساتھ لکھ چکے ہیں۔ لیکن ہمارے مولوی صاحبان اس کے بھی سخت مخالف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ زید کے ترکہ سے اس کے یتیم پوتے کو کچھ نہیں ملنا چاہیئے۔

(۰)

اسمبلی میں پیش کردہ تحریک

تصریحاتِ بالا سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ عائلی قوانین میں جو کچھ کہا گیا ہے، ان میں سے کوئی شق بھی قرآنِ کریم کے خلاف نہیں۔ بعض شقوں کو قرآنِ کریم کے احکام کے مطابق کرنے کے لئے کچھ ترمیمات کی ضرورت ہے۔ لیکن اصولی طور پر ان میں کوئی بات قرآنِ کریم کے خلاف نہیں۔ ان قوانین کی رُو سے، عورتوں اور یتیم اولاد کو وہ حقوق دلانے کی طرف پہلا قدم اٹھایا گیا ہے جو قرآنِ کریم نے انہیں عطا کئے تھے لیکن جن سے انہیں، بدقسمتی سے محروم کر دیا گیا تھا۔

لیکن قوم کی بدنصیبی ملاحظہ ہو کہ ہماری نیشنل اسمبلی کے پہلے سیشن (منعقدہ جون۔ جولائی ۱۹۶۲ء) میں یہ تحریک پیش کر دی گئی کہ ان قوانین کو منسوخ قرار دیا جائے اور ان کی بجائے، وہی پرانے قوانین رائج کر دیئے جائیں جن کی رو سے:۔

(۱) والدین (یا دیگر سرپرست) نابالغ لڑکوں اور لڑکیوں کی شادی جس جگہ جی چاہے کر دیں۔

(۲) مرد کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ جب جی چاہے، طلاق۔ طلاق۔ طلاق کہہ کر اپنی بیوی کو الگ کر دے۔ لیکن اگر بیوی کسی

کسی ظالم خاوند کے پنجہ سے رہائی حاصل کرنا چاہئے تو اسے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑے۔

(۳) مرد کو حق حاصل ہو کہ جب چاہے، دو۔ تین۔ چار تک بیویاں کرلے۔ اور

(۴) یتیم پوتے کو اس کے دادا کی وراثت سے محروم رکھا جائے۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہ چاروں شقیں قرآنِ کریم کے احکام کے خلاف ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جو بات قرآن کے خلاف ہے وہ اسلام کے بھی خلاف ہے۔ لیکن اب اصرار ہے کہ قانون یہی رائج ہونا چاہیئے۔ غنیمت ہے کہ عائلی قوانین کو منسوخ کرنے کی تحریک کا فیصلہ پہلے سیشن میں ہی نہیں ہو گیا۔ طے یہ پایا ہے کہ اسے پہلے "اسلامی مشاورتی کونسل" کی طرف بھیجا جائے۔

بدقسمتی سے ملک میں فضا ایسی پیدا کر دی گئی ہے کہ جو مسئلہ سامنے آتا ہے، اس پر دلائل و براہین اور علم و بصیرت کی روشنی میں، ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے بجائے، عوام کے جذبات کو بھڑکا دیا جاتا ہے۔ اور اس طرح، دین و دانش، سب اس سیلاب کی رَو میں بہ جاتے ہیں۔ اس کے لئے دلیل یہ دی جاتی ہے کہ ایسا صدیوں سے ہوتا چلا آرہا ہے، اس لئے اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ اسے کوئی نہیں دیکھتا کہ، جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے وہ قرآنِ مجید کے بھی مطابق ہے؟

ظاہر ہے کہ یہ دلیل کسی صورت میں بھی صحیح نہیں قرار دی جا سکتی۔ صحیح مسلک یہ ہے کہ ہمارے لئے صحیح اور غلط کا اوّلین اور بنیادی معیار، خدا کی کتاب ہے۔ ہمیں تمام جذبات اور رجحانات سے الگ ہو کر دیکھنا یہ چاہیئے کہ اس باب میں وہ کتاب ہمیں کیا راہ نمائی دیتی ہے۔ ہمارے آئین میں یہ شق موجود ہے کہ پاکستان میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہوگا جو اسلام کے خلاف ہو۔ ہم مرکزی مجلسِ قانون ساز اور (مجوزہ) اسلامی مشاورتی کونسل کے اراکین سے بالخصوص، اور ملک کے دوسرے سمجھنے سوچنے والے طبقہ سے بالعموم درخواست کریں گے کہ جو کچھ گذشتہ صفحات میں پیش کیا گیا ہے وہ اس پر نہایت ٹھنڈے دل سے غور کریں اور پھر از خود اس نتیجہ پر پہنچیں کہ مسلمانوں کی عائلی زندگی سے متعلق کون سے قوانین، اسلام کے مطابق ہیں۔ اس ضمن میں اس بنیادی اصول کو پیشِ نظر رکھیئے (اور ہمیں یقین ہے کہ آپ کا اس پر ایمان ہوگا) کہ:-

جو چیز قرآن کے خلاف ہوگی وہ کبھی اسلام کے مطابق
نہیں ہو سکتی۔

(ختم مقالہ سنہ ۱۹۶۲ء)

(۰)

یہ (عائلی) قوانین اب تک رائج ہیں لیکن اب بڑی شدّت کے ساتھ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ انہیں، منسوخ کر دیا جائے۔ آہ بیچاری حوّا کی بیٹی! ؎

میری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی
شیخ کہتا ہے کہ ہے یہ بھی حرام اے ساقی

(۰)

نقد و نظر

پروفیسر رفیع اللہ شہاب

۱۔ فتاویٰ عالمگیری۔

وطنِ عزیز میں جب بھی اسلامی قانون کے نفاذ کے سلسلے میں سرگرمیوں کا آغاز ہوتا ہے تو فتاویٰ عالمگیری کا نام اکثر سننے میں آتا ہے۔ ہمارے علماء کا ایک طبقہ جہاں یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اسلامی قانون کو زمانہ جدید کے تقاضوں کے مطابق مدوّن کیا جائے وہاں ایک دوسرے طبقے کی طرف سے اس مطالبے کی مخالفت کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ہمارے پاس فتاویٰ عالمگیری کی صورت میں اسلامی قانون پہلے ہی سے مدوّن شکل میں موجود ہے۔ بس ایک سرکاری چٹھی کے ذریعے ملک میں اسے نافذ کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ بڑا اہم مجموعۂ قوانین ہوگا۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عام قارئین کو اس سے متعارف کرایا جائے۔

مغل بادشاہ سلطان اورنگ زیبؒ عالمگیر، کہ جن کے نام سے یہ مجموعہ منسوب ہے، خود شریعت کے بہت بڑے عالم تھے۔ اپنی مملکت میں اسلامی قانون نافذ کرنے کے لئے آپ نے حنفی فقہ، کہ جس کے وہ پیرو تھے، کی تمام معتبر کتابوں کا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا۔ لیکن وہ یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ ان میں سے کونسی کتاب ہندوستانی مسلم معاشرے کی ضروریات پوری کر سکے گی۔ کافی سوچ بچار کے بعد انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس مقصد کے لئے ایک نیا مجموعۂ قوانین مرتب کرایا جائے۔ چنانچہ مملکت کے مختلف حصّوں سے آپ نے کوئی پانچ صد جید فقہاء کو جمع کیا اور یہ خدمت ان کے سپرد کی۔ ان علماء نے کافی محنت کے بعد یہ مجموعہ تیار کر کے سلطان کی خدمت میں پیش کر دیا جسے ایک حکم کے ذریعے مملکت میں نافذ کر دیا گیا۔

اس مجموعے نے اُس دَور کی، جس میں اسے مدوّن کیا گیا تھا، ضروریات کو پورا کر دیا ہوگا، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ موجودہ زمانے کے تقاضوں کو بھی پورا کر سکے گا۔ اس مقصد کے لئے اس پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے۔

ہمارے ہاں اسلامی قانون کے نفاذ کی ابتداء کرنے کے سلسلے میں یہ اعلان کیا جا چکا ہے کہ مستقبل قریب میں شرعی حدود کو نافذ کیا جانا ہے۔ اس لئے مناسب ہوگا کہ ہم اس مجموعے کے مطالعے کو صرف اسی موضوع تک محدود رکھیں۔ اسلامی حدود وہ سزائیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے خود قرآن حکیم میں مقرر فرما دی ہیں۔ اس لئے ان کی یہ اصطلاحی تعریف بیان کی جاتی ہے کہ کسی انسان حتیٰ کہ اللہ کے رسولؐ کو بھی ان میں ردّوبدل کا اختیار نہیں۔ یہ حدود مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) چوری کی سزا۔ (۲) زنا کی سزا۔ (۳) زنا کی تہمت (قذف) کی سزا۔ اور (۴) شاہراہوں پہ ڈاکے ڈالنے یا بغاوت کی مختلف سزائیں۔

سلطان اورنگ زیب عالمگیر نہایت پارسا قسم کا انسان تھا لیکن چونکہ یہ مجموعہ دورِ ملوکیت میں تیار کیا گیا تھا اس لئے اپنے ماحول سے اس کا متاثر ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ مذکورہ بالا شرعی حدود کہ جن میں اصطلاحی طور پر اللہ کے رسول ؐ کو بھی ردّ و بدل کرنے کی اجازت نہ تھی، فقہاء نے مسلمان بادشاہوں کو ان سے مستثنےٰ قرار دیا کہ اگر ان سے مذکورہ بالا جرائم سرزد ہو جائیں تو ان پر شرعی حدود نافذ نہ کی جائیں۔ فتاویٰ عالمگیری میں اس مقصد کے لئے یہ قانون بنایا گیا:۔

ایسے امام المسلمین نے جس کے اوپر امام نہیں، اگر ایسی بات کی جس سے حد واجب ہوتی ہے۔ جیسے زنا و سرقہ و شراب خوری و قذف تو اس سے مواخذہ نہ کیا جائے۔ (فتاویٰ عالمگیری اُردو جلد سوم صفحہ ۳۴۱ شائع کردہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور) فقہ میں امام سے مراد مسلمان حکمران ہوتا ہے۔ کیا ہمارے علماء آجکل کے مسلمان حکمرانوں کو یہ حقوق دینے کو تیار ہیں؟

اصل فتاویٰ عالمگیری عربی زبان میں ہے لیکن عام قارئین کی سہولت کے لئے راقم نے اُردو ایڈیشن کا حوالہ دیا ہے جو شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور کی جانب سے شائع کیا گیا ہے۔ یہ ایڈیشن چھ ہزار صفحات کی دس جلدوں پر مشتمل ہے۔

———— (۰) ————

اب ہم مختلف شرعی حدود کو دیکھتے ہیں کہ ان کے نفاذ کے لئے فتاویٰ عالمگیری میں کیا تفاصیل ملتی ہیں:۔

(۱) ہاتھ کاٹنے کی سزا

اسلام مسلمانوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ رزقِ حلال پر قناعت کریں اور کسی دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے حاصل نہ کریں۔ آجکل ان ناجائز طریقوں نے مختلف صورتیں اختیار کر لی ہیں لیکن زمانہ قدیم میں چوری اس کی سب سے بڑی صورت تھی۔ اسلام نے اس برائی کو ختم کرنے کے لئے اس کے لئے ہاتھ کاٹنے کی سخت سزا مقرر کی، لیکن فتاویٰ عالمگیری میں اس جرم کو ثابت کرنے کے لئے جن کڑی شرائط کو ضروری قرار دیا گیا ہے، اس کے بعد ایسی کوئی صورت باقی نہیں رہتی کہ جس میں ہاتھ کاٹنے کی نوبت آئے۔ چوری کا جرم دو طریقوں سے ثابت ہو سکتا ہے۔ ایک چور کے اپنے اقرار سے اور دوسرے گواہوں کی گواہی سے۔ اگر چور خود اقرار کرے تو اسے حد سے بچانے کے لئے مسلمان حکمران پہ لازم قرار دیا گیا کہ وہ اسے تلقین کرے کہ وہ چوری کا اقرار نہ کرے۔ (ص ۳۸۹) یعنی اپنے اقرار سے پھر جائے تو اس کے ہاتھ نہیں کاٹے جائیں گے۔ اور اگر چوری کا اقرار کر کے بھاگ جائے تو کبھی اس کا پیچھا نہ کیا جائے۔ نہ فی الفور، نہ بعد (ص ۳۹۳) پھر گواہوں کی گواہی کے نتیجے میں چوری ثابت ہو جانے کے باوجود مندرجہ ذیل صورتوں میں ہاتھ کاٹنے کی حد نافذ نہ ہوگی۔

جلانے کی لکڑی، گھاس، نرکل اور مچھلی کی چوری (ص ۳۹۸) دودھ، گوشت اور تازہ پھلوں کی چوری۔ (ص ۳۹۹) نمک کی چوری۔ (ص ۴۰۰) آلاتِ موسیقی اور مختلف علوم کی کتابوں کی چوری۔ (ص ۴۰۱) سونے چاندی

کی صلیب یا بت کی چوری۔ (ص۴۰۲) چاندی کے برتن کی چوری جن میں کھانے پینے کی چیزیں ہوں (ص۴۰۳)۔ سونے کے زیورات پہنے ہوئے بچے کی چوری (ص۴۰۴)۔ اگر کسی مرد یا عورت سے دغابازی کر کے مال لے لیا یا لوٹ لیا یا اُچک کر لے بھاگا، تو اس پر ہاتھ کاٹنا نہیں آتا اور کفن چور پر بھی ہاتھ کاٹنا نہیں آیا (ص۴۰۴)۔ اسی طرح اگر چور کے پاس سے کسی دوسرے چور نے مال چوری کر لیا تو چور اوّل اور مالک میں سے کسی کو یہ اختیار نہ ہوگا کہ دوسرے چور کا ہاتھ کاٹے (ص۴۰۵)۔ بیت المال (سرکاری خزانے) سے چوری میں ہاتھ نہیں کٹے گا (ص۴۰۵)۔ اگر کوئی شخص دارالحرب سے امن حاصل کر کے دارالاسلام میں آگیا تو اس کے مال کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا (ص۴۰۶)۔ اگر کسی کو مکان میں داخل ہونے کی اجازت دی گئی پھر اس نے اجازت سے داخل ہو کر کوئی چیز چرائی تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا (ص۴۰۸) اور اگر اونٹ کو راستہ سے مع اس کے بوجھ کے چرا لیا تو ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ اسی طرح اگر جوال یعنی تھیلہ کو چرا لیا تو ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ اگر اسی تھیلے کو چاک کر کے اس میں سے مال نکال لیا تو پھر ہاتھ کاٹا جائے گا (ص۴۰۸)۔ اگر کسی نے قطار میں سے اونٹ چرا لیا تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا (ص۴۰۸)۔ اگر کسی نے کسی مکان کو نقب لگائی۔ یعنی دیوار توڑی اور اندر والے چور نے مال اس نقب والی جگہ پر رکھ دیا جسے اس کے باہر والے ساتھی نے اٹھا لیا تو دونوں میں سے کسی کے ہاتھ نہ کاٹے جائیں گے (ص۴۰۹) چور ایک گدھے کو لے کر ایک مکان میں داخل ہوا، اور کپڑے جمع کر کے گدھے پر لاد کر مکان سے باہر آیا اور اپنے گھر چلا گیا۔ پھر اس کے بعد گدھا وہاں سے نکل کر اس کے گھر آگیا۔ تو اس کا ہاتھ نہ کاٹا جائے گا (ص۴۱۰)۔ اگر چور نے کسی گھر کو نقب لگا کر اس میں ہاتھ ڈال کر کوئی چیز لے لی تو ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا (ص۴۱۰)۔ اگر آستین کے باہر لٹکتی ہوئی تھیلی کو کاٹ کر درہم لے لئے تو اس کا ہاتھ نہ کاٹا جائیگا۔ ہاں اگر آستین میں ہاتھ ڈال کر تھیلی کو چاک کر کے درہم لے لئے تو ہاتھ کاٹا جائے گا (ص۴۱۱)۔ اگر قفل توڑنے والے نے دن میں بند دروازہ کھول لیا اور اس گھر میں کوئی نہیں اور سامان چوری کر لیا تو اس چور کا ہاتھ نہ کاٹا جائے گا (ص۴۱۱)۔ اگر چراگاہ سے کوئی بکری یا گائے یا اونٹ چرا لیا تو اس کا ہاتھ نہ کاٹا جائے گا (ص۴۱۲)۔ اگر کسی نے مال باپ اور دوسرے قریبی رشتہ داروں کے گھر سے ان کا یا اگر ان کے پاس کسی دوسرے کا مال پڑا ہو اس کو چرا لیا تو ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا (ص۴۱۳)۔

یہ ہیں چند تفصیلات سرقہ کے جرم کی سزا کے سلسلہ میں۔ جن تفاصیل کا تعلق غلاموں اور لونڈیوں سے تھا ان کے نقل کرنے سے مجھے کراہت سی محسوس ہوتی تھی اس لئے انہیں دانستہ قلم زد کر دیا گیا ہے۔ خیال رہے کہ اگر ہماری فقہ کی کتابوں سے غلاموں اور لونڈیوں کے مسائل خارج کر دیئے جائیں تو ان کی ضخامت نصف سے بھی کم رہ جائے۔ چوری کے بارے میں ان تفصیلات پر اگر نظر ڈالی جائے تو شاید ہی کوئی صورت ایسی باقی رہ جائے جس میں چور کا ہاتھ کاٹا جا سکے۔

(۲) زنا کی سزا

زنا ایک سخت قبیح فعل ہے جس معاشرے میں اس کا رواج پڑ جائے وہ جلد ہی تباہی کے کنارے پر پہنچ جاتا ہے۔ اس لئے اس برائی کو ختم کرنے کے لئے قرآن حکیم نے اس کے لئے سو کوڑوں کی سزا مقرر کی ہے لیکن فتاویٰ عالمگیری میں، چوری کی سزا کی طرح، اس بارے میں بھی جرم کے

ثبوت کے لئے کچھ ایسی شرائط عائد کی گئی ہیں جن سے شرعی سزا کے نفاذ کی نوبت شاذ و نادر ہی آسکتی ہے۔ یہ جرم بھی دو طرح سے ثابت ہوتا ہے۔ ایک مجرم کے اپنے اقرار سے، اور دوسرے گواہوں کی گواہی سے۔ اب اگر مجرم خود اقرار کرلے تو اسے تلقین کی جائے گی کہ وہ اپنے اقرار سے پھر جائے تاکہ وہ اس حد سے بچ سکے (صفحہ ۳۲۳)۔ یا اگر مرد نے زنا کا اقرار کیا لیکن عورت نے انکار کردیا۔ یا عورت نے اقرار کیا اور مرد نے انکار کردیا۔ تو (امام رحمۃ اللہ کے نزدیک) دونوں میں سے کسی پر حد واجب نہ ہوگی (صفحہ ۳۲۲) کسی عورت سے متعہ کا وقتی نکاح کیا اور مرد جانتا تھا کہ اسلام میں یہ نکاح حرام ہے لیکن اس کے باوجود اس نے یہ وقتی نکاح کرکے اس عورت سے مباشرت کی تو پھر بھی حد واجب نہ ہوگی (صفحہ ۳۳۲)۔ اگر بلا گواہوں کے کسی عورت سے نکاح کیا یا بلا ولی کے عورت سے نکاح کیا تو بالاتفاق اس پر حد واجب نہ ہوگی (صفحہ ۳۳۳)۔ اگر چھوٹی نابالغ بچی سے زنا کیا تو زنا کی پر حد نہ ہوگی۔ اس پر اس لڑکی کا مہر واجب ہوگا (صفحہ ۳۳۷)۔ اگر عورت کسی سوتے ہوئے مرد کے بستر میں گھس گئی اور مرد کو اپنے نفس پر قابو دے دیا تو دونوں میں سے کسی پر بھی حدِ شرعی واجب نہ ہوگی (صفحہ ۳۳۸)۔ اگر کسی غیر عورت سے لواطت کی یا فرج کے سوا کسی اور جگہ زنا کیا یا کسی لڑکے سے لواطت کی تو (امام اعظم کے نزدیک) حد لازم نہیں آئے گی، نہ اس کو تعزیر دی جائے گی اور قید میں ڈالا جائے گا۔ یہاں تک کہ وہ توبہ کرے (صفحہ ۳۳۹)۔ تعزیر کی حد تین سے ۳۹ کوڑے ہیں جو حاکم کی صوابدید پر منحصر ہیں۔ چار مردوں نے ایک شخص پر زنا کی گواہی دی جن میں سے دو گواہوں نے کہا کہ اس مرد نے اس عورت سے زبردستی زنا کیا ہے جبکہ دوسرے دو گواہوں نے کہا کہ اس عورت نے خود اسے ترغیب دی تھی، تو امام ابوحنیفہ رحمہ نے فرمایا کہ حد ان سب سے دور کردی جائے گی (صفحہ ۳۴۴)۔

(۳)۔ حدِ قذف

قذف یہ ہے کہ کسی پر زنا کی جھوٹی تہمت لگائی جائے تو اس جھوٹے گواہ پر حد قائم کی جاتی ہے جو اسّی کوڑے مقرر ہے۔ چنانچہ گواہوں پر اس قسم کی جرح ہوتی تھی کہ کسی کو گواہی دینے کی جرأت ہی نہ ہوتی۔ بلکہ اکثر زانی تو زنا کی حد سے بچ جاتے لیکن گواہ اس سزا سے نہیں بچ سکتے تھے۔ اس کی وضاحت کے لئے صرف ایک مثال کا نقل کرنا کافی ہے۔

زنا کا جرم ثابت کرنے کے لئے چار گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر چار گواہوں میں سے تین نے کسی مرد کے خلاف اس کے زنا کے جرم کے بارے میں گواہی دی اور چوتھے گواہ نے بھی ان کی تائید کردی لیکن الفاظ میں صرف یہ کہا کہ اس نے مجرم مرد اور عورت دونوں کو ایک لحاف میں دیکھا تھا، تو زنا کار مرد پر تو حد جاری نہ ہوگی لیکن پہلے تینوں گواہوں پر حدِ قذف نافذ کی جائے گی۔ یعنی انہیں اسّی اسّی کوڑے مارے جائیں گے۔ (صفحہ ۳۴۲)۔

سوچئے کہ اس قسم کے فیصلوں کے بعد کسے گواہی دینے کی جرأت ہوسکتی تھی؟

(۴)۔ شراب نوشی کی سزا

شراب نوشی کی سزا قرآن مجید میں تو مذکور نہیں لیکن فقہ میں اسے بھی حدود میں شمار کیا گیا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں بھی فتاویٰ عالمگیری میں مذکورہ بالا اسلوب کو اپناتے ہوئے اس جرم کے ثبوت کے لئے ایسی شرائط ضروری قرار دی گئی ہیں کہ پہلے

جرائم کی طرح اس میں بھی شرعی حد کے نفاذ کی نوبت نہیں آتی۔ مثلاً حرام شراب کو صرف دو جنسوں یعنی انگور اور کھجور تک محدود کیا گیا ہے باقی ہر قسم کی شراب کو جائز قرار دے دیا گیا ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ چھوہارے و انگور، تروخشک وغیرہ سے جو شرابیں بنائی جاتی ہیں۔ اگر ان کے پینے سے بے ہوش ہی کیوں نہ ہو جائے تو اس کو حد نہ ماری جائے گی (ص ۳۶۲)۔ اور جو شراب کہ حبوب و فواکہہ مثل گیہوں و جوار اور آلو بخارا وغیرہ سے بنائی جاتی ہے جب تک وہ شیریں ہوں تو ان کا پینا حلال ہے (ایضاً)۔

اس سلسلے میں زیادہ تفصیلات نقل کرنا مناسب نہیں سمجھتا اور انہی پر بس کرتا ہوں۔ جو عام قارئین کے غور و فکر کے لئے کافی ہیں۔ ان تفصیلات کی روشنی میں وہ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کیا فتاویٰ عالمگیری ہمارے جدید زمانے کی ضروریات پورا کر سکتا ہے یا ہمیں بھی سلطان اورنگ زیب عالمگیری کی طرح ایک نیا مجموعۂ قوانین مرتب کرنا ہوگا۔

(۰)

۲- اسلامی قانون کا فلسفہ بزبان انگریزی (ISLAMIC LEGAL PHILOSOPHY)

تالیف۔ ڈاکٹر محمد خالد مسعود۔ شائع کردہ۔ ادارہ تحقیقاتِ اسلامی۔ اسلام آباد۔ صفحات ۳۵۶۔ قیمت پچاس روپے

صدرِ اسلام میں مسلمانوں میں حریتِ فکر کا دور دورہ تھا۔ مختلف علاقوں کے اہلِ علم اپنے سماجی ماحول کو سامنے رکھ کر اسلامی قانون تعبیر کیا کرتے تھے[۱]۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس زمانے میں فقہ اسلامی کے کوئی ستر (۷۰) مذاہب وجود میں آ گئے۔ عدالتی فیصلوں کا طریق کار یہ تھا کہ حکومت کی طرف سے جج مقرر ہوتے اور وہ مشہور فقہاء یا ان کے شاگردوں سے رائے یا فتویٰ لے کر فیصلہ کر دیتے تھے۔ لیکن جب اسلامی ممالک میں ملوکیت کی جڑیں گہری ہوتی گئیں تو اس نے آزادیٔ فکر کو اپنے لئے زہرِ قاتل سمجھا اور یہ کوشش کی گئی کہ جہاں تک ممکن ہو سکے ان فقہی مذاہب کی تعداد کم کی جائے۔ ملوکیت کی یہ کوششیں کامیاب ہوئیں اور فقہی مذاہب کی تعداد گھٹ کر چار ہو گئی۔ اس وقت اسلامی دنیا پر کوئی نصف درجن حکومتیں قائم ہو چکی تھیں جنہوں نے ان چار میں سے کسی نہ کسی فقہی مذہب کی سرپرستی شروع کر دی تھی۔ اس طرح ان فقہی مذاہب کو مزید کم کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ اس کمی کے بعد یہ تحریک چلائی گئی کہ اب اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے اور ان فقہی مذاہب کے بانیوں نے جو فقہ مرتب کر دی ہے اسی پر عمل کیا جائے گا۔ حکومت سے وابستہ علماء نے تو اس اصول کو تسلیم کر لیا لیکن ایسے اہلِ علم کی تعداد بھی کم نہ تھی جو سلاطین کے اثر و رسوخ سے دور رہے۔ انہوں نے اجتہاد کے دروازے کے بند ہونے کو تسلیم نہ کیا۔ انہی فقہاء میں، مالکی فقہ کے ایک فقیہہ علامہ ابو اسحاق شاطبی بھی تھے۔ ان کا زمانہ آٹھویں صدی ہجری کا آخری عرصہ تھا۔ ان کا مسلک یہ تھا کہ زمانے کے تقاضے، خاص طور پر سماجی حالات بدلتے رہتے ہیں۔ اس لئے اسلامی قانون میں ایسی لچک ہونی چاہیئے کہ ان میں بدلتے ہوئے حالات کے مطابق تبدیلی کی جا سکے۔ انہوں نے اپنے اس نظریئے کو مصالح (بھلائی) کا نام دیا۔ ان کا نقطۂ نظر

---

[۱] یہ اس زمانے کی بات ہے جب اسلامی مرکزیت (خلافت علیٰ منہاجِ نبوت) باقی نہیں رہی تھی۔ دورِ خلافت میں قانون کی تعبیر کا حق صرف مرکز کو حاصل تھا نہ کہ انفرادی طور پر اہلِ علم حضرات کو۔ طلوعِ اسلام)۔

یہ تھا کہ اسلامی قانون لوگوں کی بھلائی کیلئے ہے۔ وہ کوئی جامد چیز نہیں کہ بدلتے حالات میں جس میں کوئی تبدیلی نہ کی جاسکے۔

زمانہ جدید میں زمانے کے تقاضے کچھ اس حد تک بدل گئے کہ بہت سے اسلامی قوانین کی تدوینِ جدید کی ضرورت محسوس ہوئی اور مختلف ممالک میں اس پر کام ہونے لگا۔ اس سلسلے میں دو فقہا یعنی امام ابن تیمیہؒ اور علامہ شاطبی کا نام خاص طور پر لیا جانے لگا کیونکہ ان حضرات نے اسلامی قانون میں ایسی لچک کا نظریہ پیش کیا جس کی بنا پر بدلتے ہوئے سماجی ماحول میں، اسلامی قانون میں ردّو بدل کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ان کے نظریات سے عملاً بھی فائدہ اٹھایا گیا اور مختلف ممالک میں اس گروہ کے فقہا پر تحقیقی کام بھی ہونا شروع ہوا۔ ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کے فاضل اسکالر ڈاکٹر محمد خالد مسعود صاحب نے علامہ شاطبی کے فلسفہ قانون پر بڑی محنت سے کام کیا ہے جو کتاب زیر تبصرہ کی شکل میں ہمارے سامنے آیا ہے۔ یہ تحقیقی کام علامہ موصوف کی مشہور کتاب الموافقات پر مبنی ہے جس میں اصولِ فقہ سے بحث کی گئی ہے۔ جدید اصولِ تحقیق کے مطابق ڈاکٹر صاحب نے پہلے علامہ شاطبی کے زمانہ کے سیاسی اور سماجی حالات کا جائزہ لیا ہے۔ پھر اس کی روشنی میں ان کے نظریہ "مصالح" سے بحث کی ہے کہ وہ کس طرح سماجی حالات میں تبدیلی کی بنا پر اسلامی قانون میں تبدیلی کے قائل تھے۔ اس مقصد کے لئے ڈاکٹر صاحب نے علامہ موصوف کے چالیس فتاویٰ کو بطور نمونہ پیش کیا ہے۔

اس تحقیق کا بنیادی مقصد اجتہاد کی ضرورت کا احساس دلانا ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب اس حقیقت سے بے خبر نہ ہوں گے کہ ہمارا جدید تعلیم یافتہ طبقہ پہلے ہی اجتہاد کا قائل ہے۔ جس طبقے کو اس کا قائل کرانے کی ضرورت ہے وہ ہمارے علمائے کرام کا قدامت پسند طبقہ ہے۔ لیکن اس طبقے کو قائل کرانے کے لئے ضروری تھا کہ کتاب زیر تبصرہ انگریزی کی بجائے اردو زبان میں ہوتی۔ اور ساتھ ہی چند ایک ایسے قوانین کو بطور مثال پیش کیا جاتا جن میں زمانہ حال کے تقاضوں کی رو سے علامہ شاطبی کی فکر کی روشنی میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اور ان کے بارے میں علمائے کرام کو دعوت دی جاتی کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ اس طرح سے جو بحث چلتی اُمت کے لئے اس کے نتائج مفید ثابت ہوتے۔ لیکن معلوم نہیں اسلامی تحقیق کے سرکاری ادارے اس قسم کی بحث و تمحیص سے کیوں گھبراتے ہیں حالانکہ قدامت پرست علماء کو اجتہاد کا قائل کرانے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ متقدمین سلف کے کارناموں کی اس قسم کی نظری تحقیق تو تاریخ کا حصہ بن کر رہ جاتی ہے جس کا عملی فائدہ بہت کم ہوتا ہے۔ بتانا یہ چاہیئے کہ اس قسم کی تحقیق سے دورِ حاضر میں عملاً کس طرح فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ اور یہی وہ پتھر ہے جسے ہمارے سرکاری ادارے محض چوم کر چھوڑ دیتے ہیں۔ (پروفیسر رفیع اللہ شہاب)

—— (٥) ——

۳۔ یتیم پوتے کی وراثت

تالیف مولانا محمد اسمٰعیل ذبیح راجروی (نواں شہر ایبٹ آباد)

ہمارے مروجہ قوانینِ شریعت میں جو احکام و قوانین صریحاً قرآن کریم کے خلاف ہیں ان میں ایک قانون "یتیم پوتے کی وراثت" سے بھی متعلق ہے۔ آجکل ہمارے مذہبی طبقہ کی طرف سے جن عائلی قوانین کے منسوخ کرنے کا مطالبہ کیا جارہا ہے ان میں بھی ایک قانون یہی ہے۔ چونکہ یہ مسئلہ فنی سا ہے اس لئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اسے عام فہم الفاظ میں سمجھایا جائے۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ اس کا اثر بڑا دور رس ہے۔ سب سے پہلے آپ ذیل کا نقشہ ملاحظہ کیجئے۔

زید

بٹیا حامد (زید کی زندگی میں وفات پاگیا)

محمود (پوتا)، جمید (پوتا)

بٹیا رشید (زید کی وفات کے وقت زندہ ہے)

عمران (پوتا)

آپ نے دیکھا کہ محمود اور جبار زید کے یتیم پوتے ہیں۔ ہمارے علماء حضرات کا مسلک یہ ہے کہ زید کی وفات پر اس کے ترکہ میں سے ان کے یتیم پوتوں کو کچھ نہیں مل سکتا۔ سارے کا سارا ترکہ زید کے بیٹے رشید کو ملے گا۔ بالبداہت نظر آ جائے گا کہ ان کا یہ مسلک عقل و فکر اور جذبۂ ہمدردی کے صریحاً خلاف ہے۔ یتیم تو نسبتاً زیادہ ہمدردی کے مستحق ہوتے ہیں چہ جائیکہ انہیں ان کے جائز حق سے بھی محروم کر دیا جائے اس جرم کی بناء پر کہ وہ یتیم کیوں رہ گئے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ان حضرات کا یہ مسلک خود قرآن کریم کے بھی خلاف ہے۔ ان کے ہاں کا یہ قانون صدیوں سے چلا آ رہا تھا کہ ۱۹۱۸ء میں علامہ محمد اسلم جیراجپوری (علیہ الرحمۃ) نے اس کے خلاف آواز اٹھائی اور قرآنی دلائل و شواہد سے ثابت کیا کہ یتیم پوتے کو اس کے دادا کی وراثت سے محروم نہیں رکھا جا سکتا۔ علماء حضرات کی طرف سے ان کی سخت مخالفت ہوئی۔ تشکیل پاکستان کے بعد طلوع اسلام نے اس سوال کو اٹھایا اور شرح و بسط سے واضح کیا کہ مروجہ قانون شریعت صریحاً قرآن مجید کے خلاف ہے۔ ۱۹۵۳ء میں پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں چودھری محمد اقبال چیمہ کی طرف سے ایک بل کا مسودہ پیش ہوا جس کا مقصد یہ تھا کہ یتیم پوتے کو اس کے دادا کے ترکہ سے حصہ ملنا چاہیئے۔ طلوع اسلام کی طرف سے اس بل کی بھرپور تائید ہوئی اور علماء حضرات کی طرف سے اتنی ہی شدید مخالفت۔ اس مخالفت میں سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب پیش پیش تھے۔ ان کی طرف سے پیش کردہ سب سے وزنی دلیل یہ تھی کہ:-

> سلف سے لے کر خلف تک تمام اُمت کے اہل علم اس پر متفق رہے ہیں۔ ایسے متفق علیہ مسائل کا متفق ہونا ہی بجائے خود اپنے اندر اتنا وزن رکھتا ہے کہ کوئی معقول آدمی اس سے اختلاف کی اس وقت تک جرأت نہیں کر سکتا جب تک اس کے پاس دلائل کی کوئی بڑی غیر معمولی طاقت نہ ہو۔ اور یہاں حال یہ ہے کہ جن لوگوں نے اختلاف کی جرأت کی ہے ایک طرف تو ان کے دلائل ایسے قوی نہیں ہیں کہ ان کی بناء پر اُمت کے ایک متفق علیہ مسئلہ میں تغیر کیا جا سکے اور دوسری طرف وہ قریب قریب سب کے سب کچھ ایسے ٹیڑھے ذہن کے لوگ ہیں جو ہر دینی مسئلے میں ہمیشہ ایک نرالی اُپج کی بات نکالا کرتے ہیں۔ ان کی بات اگر مانی جائے تو گویا ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ اسی ایک مسئلے ہی نہیں بلکہ پورے دین کے سمجھنے میں پہلی صدی سے لے کر آج تک ساری اُمت غلطی کرتی رہی ہے اور دین کو اگر سمجھا ہے تو صرف اس دور کے تین چار آدمیوں نے سمجھا ہے۔ اس طرح کے خبطیوں کی بات آخر کس التفات کی مستحق ہو سکتی ہے؟ (ترجمان القرآن۔ بابت جون۔ جولائی ۱۹۵۳ء)

یعنی دلیل یہ ہے کہ قرآن کریم کی طرف دعوت دینے والے مخبوط الحواس ہیں۔ ان کی بات کس التفات کی مستحق ہو سکتی ہے؟ طلوع اسلام نے بہرحال اپنے جہاد کو جاری رکھا تا آنکہ ۱۹۶۱ء کے عائلی قوانین میں یہ شق شامل ہو گئی کہ یتیم پوتوں کو ان کے دادا کے ترکہ سے حصہ ملے گا۔ اس پر نہ معلوم کتنے مظلوم یتیموں نے بدرگاہِ رب العزت سجدۂ شکرانہ ادا کیا ہو گا!

ان حضرات کی طرف سے اس قرآنی فیصلے کی مخالفت کسی حد تک ماند پڑ گئی تھی لیکن اب جو ملک میں شرعی قوانین کا عام چرچا ہونے لگا ہے تو ان کی طرف سے عائلی قوانین کی تنسیخ کا مطالبہ بھی زور پکڑ گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ قوانین منسوخ ہو گئے تو یتیم پوتے اپنے اس حق سے پھر محروم رہ جائیں گے جو انہیں قرآن دلاتا ہے۔ اور علماء حضرات اپنی اس کامیابی پر جشنِ مسرت منائیں گے۔

مولانا محمد اسماعیل ذبیح نے اس مسئلہ کو پھر اُٹھایا ہے اور زیر تبصرہ کتاب میں ثابت کیا ہے کہ ان یتیموں کو دادا کے ترکہ سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں انہوں نے زیادہ تر فقہی مسائل کی روشنی میں بحث کی ہے اور مودودی صاحب کے دلائل کا بالخصوص رد کیا ہے۔ یتیموں کو ان کا حق دلانے کی اس کوشش پر ہم انہیں مستحق مبارکباد سمجھتے ہیں۔ ایک سو پچاس صفحات

پر مشتمل یہ کتاب سفید کاغذ پر چھپی ہے اور اس کی قیمت دس روپے پچاس پیسے ہے۔

(۰)

۴۔ "یتیم پوتے کا حقِ وراثت"

قرآنی مسلک کی اس حمایت کو دیکھ کر قرآن کی مخالفت کرنے والے بھلا کیسے خاموش بیٹھ سکتے تھے۔ چنانچہ یتیم پوتوں کو محروم کرنے کی تائید میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس کا ناشر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی مرکزی انجمن خدام القرآن کا مکتبہ ہے۔ آسمان کی آنکھ نے اس قسم کا نظارہ بھی کم دیکھا ہوگا کہ "خدام القرآن" کی طرف سے قرآنی مسلک کی مخالفت ہو رہی ہے! جب ۱۹۵۳-۵۴ء میں چودھری محمد اقبال چیمہ نے مذکورہ بالا بل کا مسودہ پیش کیا تھا تو گوجرانوالہ کے ایک ایڈووکیٹ سید غلام احمد رضوی صاحب نے اس کی مخالفت میں دو مضامین شائع کئے تھے جن میں براہِ راست مخاطب علامہ اسلم جیراجپوری (علیہ الرحمۃ) اور طلوعِ اسلام سے تھا۔ زیرِ نظر کتاب ان کے انہی دو مضامین اور دو ضمیموں پر مشتمل ہے۔ کتاب کے دیباچہ میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے فرمایا ہے کہ جن اصحاب نے یتیم پوتوں کو حقِ وراثت دلانے کی تائید کی تھی:۔

یہ ان کی ذاتی رائے تھی جس کا تعلق یا تو جذبات سے ہے یا صدیوں کے نافذ شدہ ہندوانہ رواج سے۔ ان اصحاب نے خالص اسلامی نقطہ سے اس مسئلہ پر اپنی رائے قائم نہیں فرمائی۔ اور ہم نے اس مسئلہ کو صرف قرآنِ مجید کے نقطۂ نظر سے دیکھا ہے۔

اور آپ یہ معلوم کر کے حیران ہوں گے کہ سوائے ان مقامات کے جہاں علامہ اسلم (علیہ الرحمۃ) یا طلوعِ اسلام نے قرآنی آیات درج کی تھیں، زیرِ نظر ساری کتاب میں کہیں قرآنی دلیل پیش نہیں کی گئی۔ دلیل یہی ہے کہ:۔

اس کے بارے میں تمام اُمتِ مسلمہ گذشتہ چودہ صدیوں سے متفق الرائے ہے کہ مورث کے بیٹے کی موجودگی میں اس کا پوتا یا نواسہ وراثت میں حقدار نہیں ہے۔

یعنی وہ دلیل جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا (۲/۱۷۰)

جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ خدا کی کتاب کا اتباع کرو تو یہ کہتے ہیں کہ نہیں ہم تو اسی مسلک کا اتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو پایا ہے۔

کہا جا رہا ہے کہ عنقریب ایک دستوری فیصلہ نافذ ہوگا جس کی رُو سے ہر مروّجہ قانون کو عدالتوں میں چیلنج کیا جا سکے گا کہ وہ کتاب و سنّت کے مطابق ہے یا نہیں۔ بنا بریں ہم اس مسئلہ پر سرِ دست تفصیلی بحث ضروری نہیں سمجھتے۔ اس کا صحیح مقام عدالت ہوگی۔

ایک سو بیس صفحات پر مشتمل یہ کتاب سفید کاغذ پر چھپی ہے اور مجلّد کی قیمت پانچ روپے ہے۔

(۰)